۱۲ سرما ۱۹۹۳

آج

ترتیب : اجمل کمال

پریم چند گابرئیل گارسیا مارکیز ٹیڈ ہیوز
فہمیدہ ریاض ضمیرالدین احمد
ذی شان ساحل سعیدالدین محسن خاں
آئزک باشیوس سِنگر

آج کی کتابیں

آج
جنوری ۱۹۹۳

مینیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

کمپوزنگ
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۷ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک کراچی

ترتیب

پریم چند

۷

رنگیلے بابُو

گابریئل گارسیا مارکیز

۱۹

خواب دیکھنے والی

ٹیڈ ہِیوز

۲۹

شیکسپیئر

فہمیدہ ریاض

۴۴

کچھ دیے غم آدمی کے

آدمی کی زندگی

اک خزانہ فاصلوں میں خواب

یہ عشق نہ تھا آساں دل و شاعر

داروغۂ زنداں خاکم بدہن

حبیب جالب صاحب سے

ضمیرالدین احمد

۵۷

آئینے کی پُشت

ذی شان ساحل

۷۹

نظم مشرق کرِسٹوفر کی مصروفیات نظم

چیزیں اپنی جگہ تبدیل کرنا چاہتی ہیں چاقو

اس بات کا کہانی سے کوئی تعلّق نہیں ہے

خودانحصاری ایک ذاتی عمل ہے

اگر آپ یادگار دفتری کویتا

سعیدالدین

۹۲

جو مجسمے ہمیں وراثت میں ملے

تاریخ تعارف نشاط دوسرا

دروازہ باغ بنانے کے لیے غلام

محسن خاں

۹۹

زہرا

انتخاب

آئزک باشیوِس سِنگر

۱۲۵

مارکیٹ اسٹریٹ کا اِسپینوزا

۱۴۶

کیفےٹیریا

۱۶۸

تیسرا

۱۸۴

بُوزنہ گیتزل

۱۹۵

ایک شادی

پریم چند (۱۸۸۰ - ۱۹۳۶) کی وفات کے بعد ان کے بیٹے امرت رائے نے ان کی ایسی تحریروں کو، جو کسی مجموعے میں شامل نہ تھیں، جمع کر کے "گپت دھن" کے نام سے شائع کیا۔ لیکن پریم چند کی بعض تحریریں ان کی نگاہ میں بھی نہ آ سکیں۔ جو کہانی آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہے، پہلی بار الہ آباد کے ایک ہفتہ وار رسالے "بھارت" کے ۲۶ جنوری ۱۹۳۳ کے شمارے میں چھپی اور رسالے کی فائلوں میں گم ہو گئی۔ اسے ہندی کے محقق کمل کشور گوئنکا نے بازیاب کیا اور یہ دوبارہ ہندی ماہنامہ "ہنس"، الہ آباد کے جولائی ۱۹۸۷ کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ رسالہ، جسے پریم چند نے ۱۹۳۰ میں جاری کیا تھا اور جو ان کی وفات کے بعد بند ہو گیا تھا، ۱۹۸۶ میں دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کے مدیر ہندی کے معروف ادیب راجیندر یادَو ہیں۔

کچھ دن پہلے تک یہ خیال برقرار تھا کہ پریم چند اردو افسانے کا پہلا بڑا نام ہے۔ الحمدللہ کہ یہ غلط فہمی دور ہوئی۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ نے پچھلے سال گیارھویں جماعت کے اردو کے نصاب پر نظرِثانی کر کے پریم چند (اور رتن ناتھ سرشار) کو، بالآخر، اردو سے باہر کر دیا ہے۔ ظاہر ہے، اس نصاب کے مؤلف اور مدیر حضرات اس عقیدے میں راسخ ہیں کہ اردو دراصل مسلم اُمّہ کی زبان ہے اور پریم چند، سرشار، چکبست، رام نرائن موزوں، فراق گورکھپوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، فکر تونسوی اور بلونت سنگھ وغیرہ، اس رمز سے واقف نہ ہونے کی بنا پر، اردو میں لکھ کر اپنا اور ہمارا وقت ضائع کرتے رہے۔ اس نظرِثانی شدہ نصاب کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ، مثلاً، خواجہ حسن نظامی کو بھی اردو کی اس عظمت کا شعور نہ تھا اور وہ اپنی تحریروں میں سنگین بےاحتیاطیوں کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ وہ تو کہیے کہ ہمارے پاس اس نصاب کے مؤلف اور مدیر حضرات موجود ہیں جو کلاسِکس پر اصلاح دینے، بلکہ ان کو ازسرِنو تحریر کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں؛ انھوں نے خواجہ حسن نظامی کی تحریر کے ان نقائص کو بہ آسانی دور کر لیا۔ اردو زبان اپنے ان محسنوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

سو آپ اس کہانی "رنگیلے بابو" کو ہندی کے عظیم افسانہ نگار پریم چند کی کہانی سمجھ کر پڑھیے جن کی تحریریں ہندی ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں، اور جن کی اردو ادب کو کوئی ضرورت نہیں۔

پریم چند

ہندی سے ترجمہ : اجمل کمال

رنگیلے بابو

بابو رَسِک لال کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ لا کالج میں پڑھتے تھے۔ میرے سامنے ہی وہ وکیل ہوے اور آناً فاناً چمکے۔ دیکھتے دیکھتے بنگلا بن گیا، زمین خرید لی، موٹر رکھ لی اور شہر کے رئیسوں میں شمار ہونے لگے۔ لیکن مجھے نہ جانے کیوں اُن کے رنگ ڈھنگ کچھ بہت جچتے نہ تھے۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ کوئی بھلا آدمی خواہ مخواہ ٹیڑھی ٹوپی لگا کر نکلے، یا سُرمہ لگا کر، مانگ نکال کر، منھ کو پان سے پُھلا کر، گلے میں موتیا یا بیلے کے گجرے ڈالے، تن زیب کا چُنّٹ دار کرُتا اور مہین دھوتی پہنے بازار میں کوٹھوں کی اور تاک جھانک کرتا، ٹھٹّے مارتا نکلے۔ مجھے اُس سے چِڑ ہو جاتی ہے۔ وہ میرے پاس میونسپل ممبری کے لیے ووٹ مانگنے آئے تو کبھی نہ دوں، اُس سے یارانہ نبھانا تو دور کی بات ہے۔ بھلے آدمی کو ذرا گمبھیر، ذرا سادگی پسند دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اگر کسی مقدمے میں وکیل کرنا پڑے تو میں ایسے آدمی کو کبھی نہ کروں، چاہے وہ راس بِہاری گھوش ہی کا سا قانون داں کیوں نہ ہو۔ رسِک لال اسی طرح کے رنگیلے آدمی ہیں۔ اُن کی تَرک شکتی (۱) اونچے درجے کی ہے، مانتا ہوں۔ جرح بھی اچھی کرتے ہیں، یہ بھی مجھے سویکار (۲) ہے، لیکن سیدھی ٹوپی لگانے اور سیدھی چال چلنے سے اُن کی وکالت کچھ ٹھنڈی نہ پڑ جائے گی۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ بانکپن چھوڑ کر بھلے آدمی بن جائیں تو ان کی پریکٹِس دُونی ہو سکتی ہے؛ لیکن اپنے کو کیا پڑی ہے کہ کسی کی باتوں میں دخل دیں؟ جب کبھی اُن کا سامنا ہو جاتا ہے تو میں دوسری اور تاکنے لگتا ہوں یا کسی گلی میں ہو رہتا ہوں۔ میں سڑک پر ان سے باتیں کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیا ہوا وہ

نامی وکیل ہیں، اور میں بےچارہ اسکول ماسٹر ہوں؟ مجھے اُن سے کسی طرح کا دویش (۳) نہیں۔ انھوں نے میرا کیا بگاڑا ہے جو میں اُن سے جلوں؟ میری تو وہ بڑی عزّت اور خاطر کرتے ہیں۔ اپنی لڑکی کی شادی میں مَیں ان سے دریاں اور دوسرا سامان مانگنے گیا تھا۔ انھوں نے دو ٹھیلےبھر دریاں، قالینیں، جاجِم، چوکیاں مسندیں بھیج دیں۔ نہیں، مجھے ان سے ذرا بھی دویش نہیں -- بہت دنوں کے پریچے (۴) کے ناتے مجھے اُن سے سنیہہ (۵) ہے، لیکن ان کا یہ بانکپن مجھے نہیں اچھا لگتا۔ وہ چلتے ہیں تو ایسا جان پڑتا ہے جیسے دنیا کو للکارتے چلتے ہوں -- دیکھوں، میرا کوئی کیا کرسکتا ہے؟ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ ایک بار مجھے اسٹیشن پر مل گئے۔ لپک کر میرے کندھے پر ہاتھ ہی تو رکھ دیا۔ بولے، "آپ تو، ماسٹر صاحب، کبھی نظر ہی نہیں آتے۔ کبھی بھلا سال میں ایک آدھ بار تو درشن دے دیا کیجیے۔" میں نے اپنا کندھا چھڑاتے ہوئے کہا، "کیا کریں صاحب، اوکاش (۶) ہی نہیں ملتا۔" بس آپ نے چَٹ ایک بازاری شعر پڑھا:

تمھیں غیروں سے کب فرصت، کب اپنے غم سے کم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی نہ ہم خالی

میں نے ہنس تو دیا -- جو آدمی اپنا لحاظ کرے، اُس سے کوئی کیسے رُکھائی کرے؟ پھر بڑے آدمیوں سے بگاڑ کرنا بھی نہیں چاہتا؛ نہ جانے کب اپنی غرض لے کر اُن کے پاس جانا پڑے -- لیکن مجھے ان کی یہ بےتکلّفی کچھ اچھی نہ لگی۔ یوں میں نہ کوئی تپسّوی ہوں، نہ زاہد۔ اَرسِک (۷) ہونا اُس بانکپن سے بھی برا ہے۔ شُشک (۸) جیون بھی کوئی جیون ہے جس میں وِنود (۹) کے لیے کوئی استھان (۱۰) نہ ہو؟ بَن کی شوبھا ہرےبھرے، سَرَس (۱۱) ورکشوں (۱۲) سے ہے، سوکھے ہوئے ٹھونٹھوں سے نہیں، لیکن میں چاہتا ہوں آدمی جو کچھ کرے چُھپا کر کرے۔ شراب پینا چاہتے ہو، پیو، مگر پیو ایکانت (۱۳) میں۔ اس کی کیا ضرورت کہ شراب میں مست ہو کر بھکتے پھرو؟ روپ کے اُپاسک (۱۴) بننا چاہتے ہو، بنو، لیکن اس کی کیا ضرورت ہے کہ ویشیاؤں کو داہنے بائیں بٹھائے، موٹر میں اپنے چَھیل پن کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرو؟ پھر، رَسِکتا (۱۵) کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ جب لڑکے جوان ہو گئے، لڑکیوں کی شادی ہو گئی، بال پک گئے، تو میرے خیال میں آدمی کو کچھ گمبھیر ہو جانا چاہیے۔ آپ کا دل ابھی جوان ہے، بہت اچھی بات ہے، میں تمھیں اس پر بَدھائی (۱۶) دیتا ہوں۔ واسنا (۱۷) کبھی بوڑھی نہیں ہوتی،

میرا تو انوبھَو (۱۸) ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ وہ بھی پروڑھ (۱۹) ہوتی جاتی ہے، لیکن اِس عمر میں کلیلیں کرنا مجھے اوچھاپن معلوم ہوتا ہے۔ سینگ کٹا کر بَچھڑا بننے والی منوورِتّی (۲۰) کا مَیں قائل نہیں۔ کوئی کسی کا کیا کر لے گا؟ لیکن چار بھلے آدمی انگلیاں اٹھائیں، ایسا کام کیوں کرو؟ تمھیں بھگوان نے سمپنّ (۲۱) بنایا ہے، بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اپنی سمپنّتا کو اِس وِپنّ (۲۲) سنسار میں دکھاتے پھرنا، جو شودھا (۲۳) سے ویاکُل (۲۴) ہیں اُن کے سامنے رس گلّے کھانا، اس میں نہ تو رَسکتا ہے نہ آدمیت۔

رسِک لال کی بڑی لڑکی کا وِواہ (۲۵) تھا۔ مَتھُرا سے برات آئی تھی۔ ایسے ٹھاٹھ کی برات یہاں شاید ہی کبھی آئی ہو۔ بڑی دھرم شالا میں جَنواسا (۲۶) تھا۔ بَر کا پِتا کسی ریاست کا دیوان تھا۔ مَیں بھی براتیوں کی سیوا سَتکار (۲۷) میں لگا ہوا تھا۔ ایک ہزار آدمی سے کم نہ تھے۔ اِتنے آدمیوں کا ستکار کرنا ہنسی نہیں ہے۔ یہاں تو کسی برات میں سو پچاس آدمی آ جاتے ہیں تو ان کی بھی اچھی طرح خاطر نہیں ہو پاتی۔ پھر براتیوں کے مزاج کا کیا کہنا۔ سبھی تانا شاہ بن جاتے ہیں۔ کوئی چمیلی کا تیل مانگتا ہے کوئی آنولے کا، کوئی کیش رنجنا (۲۸)۔ کوئی شراب مانگتا ہے کوئی افیم۔ صابن چاہیے، عطر چاہیے۔ ایک ہزار آدمیوں کے کھانے کا پربندھ (۲۹) کرنا کتنا کٹھن ہے۔ میں سمجھتا ہوں بیس پچیس ہزار کے وارے نیارے ہوئے ہوں گے، لیکن رسِک لال کے ماتھے پر شکن نہ آئی۔ وہی بانکپن تھا، وہی وِنود، وہی بےفکری۔ نہ جھنجھلانا، نہ بگڑنا۔ براتیوں کی اور سے ایسی ایسی بےہودہ فرمائشیں ہوتی تھیں کہ ہمیں غصّہ آ جاتا تھا۔ پاؤ آدھ پاؤ بھنگ بہت ہے، یہ پنسیری بھر بھنگ لے کر کیا اس کی دُھونی دیں گے؟ جب سِنیما کے ایک سو اوّل درجے کے ٹکٹوں کی فرمائش ہوئی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ رسِک لال کو خوب ڈانٹ بتائی اور اسی کروڑھ (۳۰) میں جَنواسے کی اور چلا کہ ایک ایک کو پھٹکاروں۔ لڑکے کا بیاہ کرنے آئے ہیں یا کسی بھلے آدمی کی عزّت بگاڑنے؟ ایک دن بغیر سنیما دیکھے نہیں رہا جاتا؟ ایسے ہی بڑے شوقین ہو تو جیب سے پیسے کیوں نہیں خرچ کرتے؟ لیکن رسِک لال کھڑے ہنس رہے تھے۔ "بھائی صاحب، کیوں اتنا بگڑ رہے ہو؟ وہ لوگ تمھارے مہمان ہیں۔ مہمان دس جوتے بھی لگائے تو برا نہ مانیے۔ یہ سب زندگی کے تماشے ہیں۔ تماشے میں ہم خوش ہونے جاتے ہیں۔ لپک کر سنیماگھر سے سو ٹکٹ لا دیجیے۔ سو دو سو روپے کا منھ نہ دیکھیے۔" میں نے من میں کہا، مفت کا

دَھن بٹورا ہے تو لُٹاؤ اور نام لُوٹو۔ یہ کوئی ستکار نہیں ہے کہ مہمان کی غلامی کی جائے۔ مہمان اُسی وقت تک مہمان ہے جب وہ مہمان کی طرح رہے۔ جب وہ رعب جمانے لگے، بےعزّت کرنے پر آمادہ ہو جائے، تو وہ مہمان نہیں شیطان ہے۔

اس کے تین مہینے بعد سنا کہ رسِک لال کا داماد مر گیا، وہی جس کی نئی شادی ہوئی تھی۔ سول سروس کے لیے انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ وہاں نمونیا ہو گیا۔ یہ خبر سنتے ہی مجھے رومانچ (۳۱) ہو آیا۔ اُس یُووک (۳۲) کی صورت آنکھوں میں دوڑ گئی۔ کتنا سومیہ (۳۳)، کتنا پرتِبھاشالی (۳۴) لڑکا تھا۔ اور مَرا جا کر انگلینڈ میں، کہ گھروالے دیکھ بھی نہ سکیں۔ اور اُس لڑکی کی کیا دَشا (۳۵) ہو گی جس کا سروناش (۳۶) ہو گیا؟ ابھی ہاتھ کی مہندی بھی تو نہ چُھوٹی تھی۔ چُندری بھی تو ابھی مَیلی نہیں ہوئی۔ واہ رے دیالو (۳۷) بھگوان! اور واہ رے تمھاری لِیلا! (۳۸) پَرانیوں (۳۹) کی ہولی بنا کر اس کی لپٹوں کا تماشا دیکھتے ہو۔ اُسی وقت بھاگا ہوا رسِک لال کے پاس گیا اور ان کی صورت دیکھتے ہی من کی کچھ ایسی دَشا ہوئی کہ چِنگھاڑ مار کر رو پڑا۔ رسِک لال آرام کرسی پر لیٹے ہوے تھے۔ اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور اُسی استِھر (۴۰)، آوِچالِت (۴۱)، نِردُندھ (۴۲) بھاو سے بولے، "واہ ماسٹر صاحب، آپ نے تو بالکوں کو بھی مات کر دیا، جن کی مٹھائی کوئی چھین کر کھا جائے تو رونے لگتے ہیں۔ بالک تو اس لیے روتا ہے کہ اُس کے بدلے میں دوسری مٹھائی مل جائے۔ آپ تو ایسی چیز کے لیے رو رہے ہیں جو کسی طرح مل ہی نہیں سکتی۔ ارے صاحب، یہاں بےحیا بن کر رہیے۔ مار لیتے جائیے اور مونچھوں پر تاو دیتے جائیے۔ مزا تو تب ہے کہ جلّاد کے پیروں تلے آ کر بھی وہی اکڑ بنی رہے۔ اگر ایشور ہے، مجھے تو کچھ معلوم نہیں، لیکن سنتا ہوں کہ وہ دیالو ہے، اور دیالو ایشور بھلا نِردئی (۴۳) کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کسے مارتا ہے، کسے جِلاتا ہے، ہم سے مطلب نہیں۔ اُس کے کھلونے ہیں، کھیلے یا توڑے، ہم کیوں اس کے بیچ میں دخل دیں؟ وہ ہمارا دشمن نہیں، نہ ظالم بادشاہ ہے کہ ہمیں ستا کر خوش ہو۔ میرا لڑکا گھر میں آگ بھی لگا دے تو میں اس کا دشمن نہ بنوں گا۔ میں نے تو اُسے پال پوس کر بڑا کیا ہے، اُس سے کیا دشمنی کروں؟ بھلا ایشور کبھی نِردئی ہو سکتا ہے جس کے پریم کا سوَروپ (۴۴) یہ برہمانڈ (۴۵) ہے؟ اگر ایشور نہیں ہے، مجھے معلوم نہیں، اور کوئی ایسی شکتی ہے جسے ہماری وِپتّی

(۴۶) میں آنند (۴۷) ملتا ہے تو صاحب، یہاں رونے والے نہیں۔ ہاتھوں میں طاقت ہوتی اور دشمن نظر آتا تو ہم بھی کچھ جواں‌مردی دکھاتے۔ اب اپنی بہادری دکھانے کا اِس کے سوا اَور کیا سادَھن (۴۸) ہے کہ مار کھاتے جاؤ اور ہنستے جاؤ، اکڑتے جاؤ؟ رونا تو اپنی ہار کو سویکار کرنا ہے۔ مار لے سالے، جتنا چاہے مار لے، لیکن ہنستے ہی رہیں گے۔ مکّار بھی ہے، جادوگر بھی۔ چھپ کر وار کرتا ہے۔ آ جائے سامنے، تو دکھاؤں۔ ہمیں تو اپنے اُن بےچارے شاعروں کی ادا پسند ہے جو قبر میں بھی معشوق کے پازیب کی جھنکار سن کر مست ہوتے رہتے ہیں۔"

اس کے بعد رسِک لال نے اردو شعروں کا تانتا باندھ دیا اور اس طرح تَنمئے (۴۹) ہو کر اُن کا آنند اٹھانے لگے مانو کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ پھر بولے، "لڑکی رو رہی ہے۔ میں نے کہا، ایسے بےوفا کے لیے کیا رونا جو تمھیں چھوڑ کر چل دیا؟ اگر اُس سے پریم ہے تو رونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پریم تو آنند کی وَستُو (۵۰) ہے۔ اگر کہو، کیا کریں، دل نہیں مانتا، تو دل کو مناؤ۔ بس دُکھی مت ہو۔ دُکھی ہونا ایشور کا اَپمان (۵۱) کرنا ہے اور مانَوتا (۵۲) کو کلَنکِت (۵۳)۔"

میں رسِک لال کا منھ تاکنے لگا۔ انھوں نے یہ کتھن (۵۴) کچھ ایسے اداس بھاو سے کیا کہ ایک چِھن (۵۵) کے لیے مجھ پر بھی اُس نے جادو کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مَیں وہاں سے چلا تو دل کا بوجھ بہت کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ من میں ایک پرکار (۵۶) کا ساہَس (۵۷) اُدے (۵۸) ہو گیا تھا جو وِپتّی اور بادھا (۵۹) پر ہنس رہا تھا۔

تھوڑے دنوں کے بعد وہاں سے تبادلہ ہو گیا اور رسِک لال جی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کوئی سال بھر کے بعد ایک دن گلابی لفافے پر سنہرے اکھشروں (۶۰) میں چَھپا ہوا ایک نِمنترن پَتر (۶۱) ملا۔ رَسِک لال کے بڑے لڑکے کا وِواہ ہو رہا تھا۔ نوید کے نیچے قلم سے آگرہہ (۶۲) کیا گیا تھا کہ "اَوَش (۶۳) آئیے، ورنہ مجھے آپ سے بڑی شکایت رہے گی۔ آدھا مزا جاتا رہے گا۔" ایک اردو کا شعر بھی تھا:

اِس شوقِ فراواں کی یارب، آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کرے وہ یا وعدہ، ہم رستا دیکھتے رہتے ہیں

ایک سَپتاہ (۶۴) کا سَمے تھا۔ میں نے نئی ریشمی اچکن بنوائی، نئے جوتے خریدے، اور خوب بَن ٹھن کر چلا۔ بہو کے لیے ایک اچھی سی کشمیری ساڑی لے لی۔ مہینوں ایک جگہ رہتے رہتے اور ایک ہی کام کرتے کرتے من کچھ کُنٹھت (۶۵) سا ہو گیا تھا۔ تین چار دن خوب جلسے رہیں گے، گانے سنوں گا، دعوتیں اُڑاؤں گا۔ من بہل ہو جائے گا۔ ریل گاڑی سے اتر کر ویٹنگ روم میں گیا اور اپنا نیا سوٹ پہنا۔ بہت دنوں بعد نیا سوٹ پہننے کی نوبت آئی تھی، پر آج بھی مجھے نیا سوٹ پہن کر وہی خوشی ہوئی جو لڑکپن میں ہوتی تھی۔ من کتنا ہی اداس ہو، نیا سوٹ پہن کر ہَرا ہو جاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں بیماری میں بہت سی دوائیں نہ کھا کر ہم نیا سوٹ بنوا لیا کریں تو کم سے کم اُتنا فائدہ تو ضرور ہی ہو گا جتنا دوا کھانے سے ہوتا ہے۔ کیا یہ کوئی بات ہی نہیں کہ ذرا دیر کے لیے آپ اپنی ہی آنکھوں میں کچھ اونچے ہو جائیں؟ میرا انوبَھو تو یہ کہتا ہے کہ نیا سوٹ ہمارے اندر ایک نیا جیون ڈال دیتا ہے، جیسے سانپ کینچُل بدلے یا بسنت میں ورکشوں میں نئی کونپلیں نکل آئیں۔

اسٹیشن سے نکل کر میں نے تانگا لیا اور رسِک لال کے دوار پر پہنچا۔ تین بجے ہوں گے۔ لُو چل رہی تھی۔ منہ جُھلسا جاتا تھا۔ دوار پر شہنائیاں بج رہی تھیں۔ بندنواریں (۶۶) بندھی ہوئی تھیں۔ تانگے سے اتر کر اندر کے صحن میں پہنچا۔ بہت سے آدمی آنگن کے صحن کے بیچ میں گھیرا باندھے کھڑے تھے۔ میں نے سمجھا کہ شاید جوڑے گہنے کی نمائش ہو رہی ہو گی۔ بھیڑ چیر کر گھُسا۔ بس کچھ نہ پوچھو کیا دیکھا۔ وہ دیکھا جو ایشور ساتویں بَیری (۶۷) کو بھی نہ دکھائے۔ ارتھی تھی، پکّے کام کے دوشالے سے ڈھکی ہوئی، جس پر پھول بکھرے ہوے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گر پڑوں گا۔

سہسا (۶۸) رسِک لال پر میری نگاہ پڑ گئی۔ رنگین کپڑوں کا ایک گٹھر لیے اندر سے آئے تھے۔ نہ آنکھوں میں آنسو، نہ مکھ پر ویدنا (۶۹)، نہ ماتھے پر شکن۔ وہی بانکی ٹوپی تھی، وہی ریشمی کرتا، وہی مہین تن زیب کی دھوتی۔ سب رو رہے تھے، کوئی آنسوؤں کے ویگ (۷۰) کو روکے ہوے تھا، کوئی شوک (۷۱) سے وہوَل (۷۲)۔ یہ باہر کے آدمی تھے۔ کوئی متر (۷۳) تھا، کوئی بَندھو (۷۴)۔ اور جو مرنےوالے کا باپ تھا، وہ اِن ڈگمگانے والی نَوکاؤں اور جہازوں کے بیچ میں استمبھ (۷۵) کی بھانت (۷۶) کھڑا تھا۔

میں دوڑ کر اُن کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ وہ پانی کی بوند جو پتّے پر رکی ہوئی تھی، ذرا سی ہَوا پا کر ڈھلک پڑی۔

رسِک لال نے مجھے گلے سے لگاتے ہوے کہا، "آپ کب آئے؟ کیا ابھی چلے آ رہے ہیں؟ واہ، مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ شادی کی تیّاریوں میں ایسا پھنسا کہ مہمانوں کی خاطرداری بھی نہ کر سکا۔ چل کر کپڑے اتاریے، منھ ہاتھ دھوئیے۔ ابھی برات میں چلنا پڑے گا۔ پوری تیاری کے ساتھ چلیں گے۔ بینڈ، بِین، تاشا، شہنائی، نکاڑا (۷۷)، ڈفلی، سبھی کچھ ساتھ ہوں گے۔ کوتَل گھوڑے، ہاتھی، سواریاں، سب کچھ منگائی ہیں۔ آتش بازی، پھولوں کے تخت، خوب دُھوم سے چلیں گے۔ جیٹھے (۷۸) لڑکے کا بیاہ ہے۔ خوب دل کھول کر کریں گے۔ گنگا کے تٹ (۷۹) پر جنواسا ہو گا۔"

ان شبدوں میں شوک کی کتنی بَھیَنکر (۸۰)، کتنی اتھاہ ویدنا تھی۔ ایک کہرام مچ گیا۔

رسِک لال نے لاش کے سر پر بیلوں کا مور (۸۱) پہنا کر کہا، "کیوں روتے ہو بھائیو؟ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے۔ روز ہی تو یہ تماشا دیکھتے ہیں، کبھی اپنے گھر میں کبھی دوسرے کے گھر میں۔ روز ہی تو روتے ہو، کبھی اپنے دُکھ سے کبھی پرائے دُکھ سے۔ کون تمھارے رونے کی پروا کرتا ہے؟ کون تمھارے آنسو پونچھتا ہے؟ کون تمھاری چِیتکار (۸۲) سنتا ہے؟ تم روئے جاؤ، وہ اپنا کام کیے جائے گا۔ پھر رو کر کیوں اپنی دُربَلتا (۸۳) دکھاتے ہو؟ اُس کی چوٹوں کو چھاتی پر لو اور ہنس کر دکھا دو تم ایسی چوٹوں کی پروا نہیں کرتے۔ اُس سے کہو، تیرے آسترالے (۸۴) میں جو سب سے گھاتک (۸۵) استر (۸۶) ہو وہ نکال لا۔ یہ کیا سوئیاں سی چبھوتا ہے؟ پر ہماری کوئی دلیل نہیں سنتا۔ نہ سنے۔ ہم بھی اپنی اکڑ نہ چھوڑیں گے۔ اُسی دھوم دھام سے برات نکالیں گے، خوشیاں منائیں گے۔"

رسِک لال روتے تو اَور لوگ بھی انھیں سمجھاتے۔ اِس وِدروہ (۸۷) بھری للکار نے سب کو استمبِھت (۸۹) کر دیا۔ سمجھاتا کون؟ ہمیں وہ للکار وِکشِپت (۹۰) ویدنا سی جان پڑی، جو آنسوؤں سے کہیں مرماتک (۹۱) تھی۔ چنگاری کے اسپرش (۹۲) سے آبلے پڑ جاتے ہیں۔ دہکتی ہوئی آگ میں پاؤں پڑ جائے تو بُھن جائے گا، آبلے نہ پڑیں گے۔ رسِک لال کی ویدنا وہی دہکتی ہوئی آگ تھی۔

لاش موٹر پر رکھی گئی۔ موٹر کو گلاب کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔

کسی نے پکارا، "رام نام ستّیہ (۹۳) ہے---"

رسِک لال نے اُسے وِنود بھری آنکھوں سے دیکھا۔ "تم بھُولے جاتے ہو لالہ، یہ وِواہ کا اُتسَو (۹۴) ہے۔ ہمارے لیے ستّیہ جیون ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے مِتھیا (۹۵) ہے۔"

باجے گاجے کے ساتھ برات چلی۔ اِتنا بڑا جلوس تو میں نے شہر میں نہیں دیکھا۔ وِواہ کے جلوس میں دو چار سو آدمیوں سے زیادہ نہ ہوتا۔ اِس جلوس کی سنکھیا (۹۶) لاکھوں سے کم نہ تھی۔ دھنّیہ (۹۷) ہو رسِک لال، دھنّیہ ہو تمھارا کلیجا۔ رسِک لال اُسی بانکی ادا سے موٹر کے پیچھے گھوڑے پر سوار چلے جا رہے تھے۔ جب لاش چِتا پر رکھی گئی تو رسِک لال نے ایک بار زور سے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ مانَوتا نے وِدروہی آتما (۹۸) کو آندولِت (۹۹) کیا۔ پر دوسرے ہی چھن اُن کے مُکھ پر وہی کٹھور مُسکان چمک اُٹھی۔ مانَوتا وہ تھی یا یہ، کون کہے؟

اُس کے دو دن بعد میں نوکری پر لوٹ گیا۔ جب چھٹّیاں ہوتی ہیں تو رسِک لال سے ملنے آتا ہوں۔ انھوں نے اُس وِدروہ کا ایک آنش (۱۰۰) مجھے بھی دے دیا ہے۔ اب جو کوئی اُن کے آچار وِوہار (۱۰۱) پر آکشیپ (۱۰۲) کرتا ہے تو میں کیول (۱۰۳) مسکرا دیتا ہوں۔

فرہنگ

(۱) تَرک شکتی : قوتِ استدلال۔
(۲) سویکار : قبول۔
(۳) دویش : حسد۔
(۴) پریچے : تعارف۔ جان پہچان۔
(۵) سنیہہ : اُنس۔ لگاؤ۔
(۶) اَوکاش : فرصت۔
(۷) اَرسِک : خشک مزاج۔
(۸) شُشک : خشک۔ روکھا پھیکا۔
(۹) وِنود : ہنسی مذاق۔ کھیل۔ دلچسپی۔
(۱۰) استھان : جگہ۔
(۱۱) سَرَس : ہرے بھرے۔ شاداب۔

(۱۲) ورکش : درخت۔
(۱۳) ایکانت : تنہائی۔
(۱۴) اُپاسک : شیدائی۔
(۱۵) رَسِکتا : شوقین مزاجی۔
(۱۶) بَدھائی : مبارک باد۔
(۱۷) واسنا : ہوس۔ خواہش۔
(۱۸) انوبھَو : تجربہ۔
(۱۹) پروڑھ ہونا : پروان چڑھنا۔
(۲۰) منووِرتّی : نفسیات۔ فطرت۔
(۲۱) سمپَنّ : خوش حال۔ صاحبِ حیثیت۔
(۲۲) وِپَنّ : دکھی۔ مصیبت زدہ۔
(۲۳) شودھا : فاقہ۔ بھوک۔ غربت۔
(۲۴) ویاکُل : بےکل۔ بےچین۔
(۲۵) وِواہ : بیاہ۔
(۲۶) جَنواسا : برات کے ٹھہرنے کی جگہ۔
(۲۷) سَتکار : خاطرداری۔ تواضع۔
(۲۸) کیش رنجنا : کسی خوشبودار تیل کا نام۔
(۲۹) پربندھ : بندوبست۔ انتظام۔
(۳۰) کرودھ : غصّہ۔ طیش۔
(۳۱) رومانچ ہونا : رونگٹے کھڑے ہو جانا۔
(۳۲) یُووک : جوان۔
(۳۳) سومیہ : مہذّب۔ نرم خُو۔
(۳۴) پرتِبھاشالی : شان دار۔
(۳۵) دَشا : حالت۔
(۳۶) سَروناش : (ستیاناس۔) خاتمہ۔ سب کچھ اُجڑ جانا۔
(۳۷) دیالو : رحم دل۔ مہربان۔
(۳۸) لِیلا : قدرت۔
(۳۹) پَرانی : جان دار۔
(۴۰) استِھر : ساکت۔ پُرسکون۔
(۴۱) اُوِچالِت : الگ تھلگ۔ بےنیاز۔
(۴۲) نِردُندھ : کشمکش سے خالی۔
(۴۳) نِردئی : ظالم۔ سفّاک۔
(۴۴) سوَروپ : عکس۔
(۴۵) برہمانڈ : کائنات۔
(۴۶) وِپتّی : پریشانی۔ دُکھ۔ مصیبت۔

(۴۷) آنند : سکون۔ مزا۔
(۴۸) سادھن : ذریعہ۔ طریقہ۔
(۴۹) تَنمُے : مستعد۔
(۵۰) وَستُو : چیز۔ شے۔
(۵۱) اَپمان : توہین۔ ہتک۔
(۵۲) مانوتا : انسانیت۔ آدمیت۔
(۵۳) کلنکت کرنا: کلنک لگانا۔ بٹا لگانا۔
(۵۴) کتھن : بات۔ کہنا۔
(۵۵) چھن : لمحہ۔
(۵۶) پرکار : طرح۔ قسم۔
(۵۷) ساہَس : حوصلہ۔
(۵۸) اُدے : ظاہر۔ نمودار۔
(۵۹) بادھا : مشکل۔ مصیبت۔
(۶۰) اکھشر: حرف۔
(۶۱) نِمنترن پَتر : دعوت نامہ۔
(۶۲) آگرہہ : التجا۔ اصرار۔ تاکید۔
(۶۳) آوَش : ضرور۔
(۶۴) سَپتاہ : ہفتہ۔
(۶۵) کُنٹھت : بےکیف۔ بوجھل۔
(۶۶) بندن واریں : سجاوٹ کے لیے ڈوریاں جن پر ہرے پتّے بندھے ہوتے ہیں۔
(۶۷) بَیری : دشمن۔
(۶۸) سہسا : اچانک۔
(۶۹) ویدنا : دُکھ۔
(۷۰) ویک : بہاؤ۔
(۷۱) شوک : غم۔ صدمہ۔
(۷۲) وہوَل : نڈھال۔
(۷۳) متر : دوست۔
(۷۴) بَندُھو : بھائی۔
(۷۵) استمبھ : ستون۔
(۷۶) بھانت : مانند۔ طرح۔
(۷۷) نگاڑا : نقارہ۔
(۷۸) جیٹھا لڑکا : بڑا بیٹا۔
(۷۹) تٹ : کنارہ۔
(۸۰) بھَیَنکر : بھیانک۔
(۸۱) مور : سہرا۔

(۸۲) چیتکار : فریاد۔
(۸۳) دُربَلتا : کم زوری۔
(۸۴) آسترالے : اسلحہ خانہ۔
(۸۵) گھاتک : زخمی کرنے والا۔ تیز۔
(۸۶) استر : ہتھیار۔
(۸۷) وِدروہ : بغاوت۔ سرکشی۔
(۸۹) استمبھت : ساکت۔
(۹۰) وِکشِپت : پوشیدہ۔
(۹۱) مرماتک : پُراثر۔ اندوہ ناک۔
(۹۲) اسپرش : لمس۔
(۹۳) ستیہ : حق۔
(۹۴) اُتسَو : تقریب۔ تہوار۔
(۹۵) متھیا : جھوٹ۔ فریبِ نظر۔
(۹۶) سنکھیا : تعداد۔
(۹۷) دھنیہ : آفریں۔
(۹۸) وِدروہی آتما : باغی روح۔
(۹۹) آندولت کرنا: منقلب کرنا۔
(۱۰۰) انش : حصہ۔ جز۔
(۱۰۱) آچار وِوہار : طورطریقے۔
(۱۰۲) آکشیپ : طنز۔ اعتراض۔
(۱۰۳) کیول : صرف۔ محض۔

گابریئل گارسیا مارکیز، جن سے "آج" کے پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں، ۱۹۷۶ سے یوروپ میں جا بسنے والے لاطینی امریکیوں کی کہانیاں لکھنے میں مصروف ہیں۔ ان کہانیوں کا مجموعہ *Twelve Pilgrim Voices* اس سال کے موسمِ بہار میں انگریزی میں جوناتھن کیپ کی جانب سے شائع ہو گا۔ مارکیز کی جس کہانی کا ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے وہ لندن سے شائع ہونے والے جریدے *Granta* کے شمارہ ۴۱ (خزاں ۱۹۹۲) میں *(Frau Frida)* Dreams for Hire کے عنوان سے شائع ہوئی:

گابریئل گارسیا مارکیز

انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

خواب دیکھنے والی

صبح کے نو بجے، جب ہم ہَوانا کے ہوٹل رِیویئرا کے ٹیریس میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے، یک لخت سمندر میں ایک دہشت ناک لہر اٹھی -- حالاں‌کہ دن دُھوپ بھرا اور پُرسکون تھا -- اور ایک بڑے شور کے ساتھ ہم پر آ پڑی۔ اتنی زبردست لہر تھی کہ اس نے ساحل پر سے گزرتی ہوئی کاروں کو، اور نزدیک پارک کی ہوئی کچھ کاروں کو بھی، اٹھا کر ہوا میں اُچھال دیا اور ہمارے ہوٹل کے پہلو میں دے مارا۔ ڈائنامائٹ کا سا دھماکا تھا جس نے ہمارے ہوٹل کی عمارت کی بیس منزلوں میں سراسیمگی پھیلا دی اور لابی کو ٹوٹے ہوے شیشوں کے ڈھیر میں بدل ڈالا۔ ہوٹل میں مقیم بہت سے مسافر جو وہاں بیٹھے تھے، فرنیچر کی طرح زیروزبر ہو گئے اور کئی ایک کو ٹوٹے ہوے شیشوں کی بوچھار نے زخمی کر دیا۔ وہ یقیناً نہایت غیرمعمولی قامت کی طوفانی لہر رہی ہو گی؛ گو ہوٹل کی عمارت کو سمندر کی جانب ایک دیوار اور اس سے آگے ایک چوڑی دوطرفہ سڑک نے حفاظت میں لے رکھا تھا، مگر لہر اتنی قوّت سے حملہ آور ہوئی کہ شیشے کی دیواروں والی لابی کو نیست و نابود کر دیا۔

کیوبَن رضاکار، مقامی فائربریگیڈ کی مدد سے، فوراً ملبے کو سمیٹنے میں لگ گئے اور چھ گھنٹے سے کم وقت میں، ہوٹل کے سمندر کی جانب کھلنے والے پھاٹک کو بند کر کے اور ایک متبادل راستا کھول کر، انھوں نے ہر چیز کو معمول کے مطابق کر دیا۔ اس پورے وقت میں کسی کی توجّہ اُس کار کی طرف نہ گئی جو ہوٹل کی دیوار سے ٹکرا کر چکناچور ہو گئی تھی، اور سب اسے اُن گاڑیوں میں شمار کرتے رہے جو سڑک کے کنارے پارک کی ہوئی

تھیں۔ جس وقت اسے کرین کی مدد سے ہٹایا جانے لگا تو اندر ایک عورت کی لاش کی موجودگی کا انکشاف ہوا جسے سیٹ بیلٹ نے ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ جکڑ رکھا تھا۔ ٹکّر اتنی زوردار تھی کہ اس کے جسم کی کوئی ایک ہڈّی بھی ٹوٹنے سے نہ بچی تھی۔ اس کا چہرہ مسخ اور ناقابلِ شناخت تھا، پنڈلیوں تک لمبے بوٹ سلائی پر سے اُدھڑ گئے تھے اور لباس دھجّی دھجّی ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی جو سلامت رہ گئی تھی؛ انگوٹھی سانپ کی شکل میں بنی ہوئی تھی اور سانپ کی آنکھوں کی جگہ زمرّد جڑے ہوے تھے۔ پولیس نے پتا لگایا کہ وہ عورت نئے پُرتگالی سفیر اور اس کی بیوی کی گھریلو ملازمہ تھی۔ درحقیقت وہ ان کے ساتھ پندرہ روز پہلے ہی وہاں پہنچی تھی اور اُس صبح ان کی نئی کار میں بازار جانے کے لیے نکلی تھی۔ جب میں نے اخباروں میں اس واقعے کے بارے میں پڑھا تو اس عورت کے نام نے مجھ میں کوئی ردِعمل پیدا نہ کیا لیکن اُس انگوٹھی کے ذکر نے مجھے متجسّس کر دیا جو سانپ کی شکل کی تھی اور جس میں آنکھوں کی جگہ زمرّد جڑے ہوے تھے۔ مگر بدقسمتی سے مَیں یہ نہ جان سکتا تھا کہ انگوٹھی کون سی انگلی میں تھی۔

یہ ایک بیحد اہم تفصیل تھی؛ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ عورت وہ ہے جس سے میں واقف رہا ہوں اور جسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا، اگرچہ مجھے اس کا نام کبھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ وہ بھی سانپ کی شکل کی انگوٹھی پہنتی تھی جس میں آنکھوں کی جگہ زمرّد جڑے ہوے تھے، لیکن وہ اسے ہمیشہ اپنی پہلی انگلی میں پہنا کرتی تھی جو اُس زمانے میں بھی ایک غیرازمعمول بات تھی۔ میں اُس سے چھیالیس سال پہلے ویانا میں ملا تھا جب وہ ایک مےخانے میں، جہاں لاطینی امریکی طلبا بہت آیا کرتے تھے، ساسج اور اُبلے ہوے آلو کھانے اور پیپے سے براہِ راست بیئر پینے میں مشغول تھی۔ میں اُسی صبح روم سے وہاں پہنچا تھا اور مجھے آج تک وہ تاثّر یاد ہے جو اس کے اوپیرا کی مغنّیہ کے سے بھرےبھرے سینے، اس کے کوٹ کے کالر کے گرد جمع جھولتی ہوئی پَشموں اور سانپ کی شکل کی اس مصری انگوٹھی نے مجھ پر طاری کیا تھا۔ وہ کسی ہانپتے ہوے دُکان دار کے سے انداز میں بہت ابتدائی قسم کی ہسپانوی بول رہی تھی اور میں نے اسے آسٹریائی -- اُس طویل میز کے گرد بیٹھے ہوے تمام لوگوں میں واحد آسٹریائی -- فرض کر لیا۔ میرا خیال غلط نکلا؛ وہ کولومبیا میں پیدا ہوئی تھی اور اس نے دونوں

جنگوں کے درمیانی عرصے میں موسیقی اور گائیکی سیکھنے کی غرض سے آسٹریا کا سفر اختیار کیا تھا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی، اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ رہی ہو گی اور وہ اپنے وقت سے پہلے ہی ڈھلنے لگی تھی۔ اس کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک سحر تھا اور، علاوہ ازیں، وہ میری جان پہچان کے سب سے زیادہ خوف زدہ کر دینے والے افراد میں سے تھی۔

اُس زمانے میں -- یعنی سن چالیس کی دہائی کے اواخر میں -- ویانا کی حیثیت ایک قدیم دارالسّلطنت سے زیادہ کی نہ رہ گئی تھی جسے تاریخ نے دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں رونما ہونے والی دو باہم منحرف دنیاؤں کے درمیان واقع ایک دورافتادہ علاقائی صدرمقام میں بدل ڈالا تھا اور جو بلیک مارکیٹ اور بین الاقوامی جاسوسی کی جنّت کی طرح تھا۔ میں اس سے زیادہ موزوں گردوپیش کا اپنی اس سرگرداں ہم وطن کے لیے تصوّر نہیں کر سکتا تھا جو نکّڑ کے اس مےخانے میں محض اپنی اصل سے دور ہونے کی بےقراری میں آیا کرتی تھی، حالاں‌کہ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اسے، اس میں آنےجانے والوں سمیت، خرید سکتی تھی۔ اس نے ہمیں اپنا اصل نام کبھی نہیں بتایا؛ ہم سب اسے ہمیشہ زبان کو بل دینے والے اُس جرمن نام سے یاد کیا کیے جو لاطینی امریکی طلبا نے اس کے لیے وضع کیا تھا: فراؤ فریڈا۔ جوں‌ہی میرا اس سے تعارف ہوا، مَیں اس سے یہ سوال کرنے کی اتّفاقیہ جسارت کر بیٹھا کہ وہ کولومبیا کے خطّے کی نیدو کے، تیز ہوا کے جھکّڑوں کی زد میں واقع پہاڑی مقام سے دنیا کے اس حصّے میں کیوں‌کر آ پہنچی۔ اس نے حقیقت گویانہ انداز میں جواب دیا: "میں معاوضے پر لوگوں کے لیے خواب دیکھتی ہوں۔"

یہ اس کی معاش تھی۔ وہ کالداس کے قدیمی علاقے کے ایک خوش‌حال دُکان دار کے گیارہ بچّوں میں تیسری تھی، اور بولنے کی عمر کو پہنچنے تک یہ عادت اختیار کر چکی تھی کہ ناشتے سے پہلے -- جب، اس کے بیان کے مطابق، اس کی پیش گوئی کی قوّت اپنی خالص ترین صورت میں ہوتی تھی -- اپنے تمام خواب گھروالوں کو سنایا کرتی تھی۔ سات برس کی عمر میں اس نے خواب دیکھا کہ ایک طوفانی ریلا اس کے ایک بھائی کو بہا لے گیا ہے، اس

کی ماں نے، محض اعصابی وہم زدگی کے زیرِاثر، اپنے بیٹے کو اس کے سب سے پُرلطف شغل، یعنی پہاڑی تالاب میں تیرنے، کی ممانعت کر دی۔ لیکن فراؤ فریڈا اپنی پیش گوئیوں کی تعبیر کرنے کا اپنا نجی نظام اُس وقت تک وضع کر چکی تھی۔

"خواب کا مطلب یہ نہیں ہے،" اس نے وضاحت کی، "کہ وہ ڈوب کر مرے گا، بلکہ یہ ہے کہ اسے مٹھائیاں نہیں کھانی چاہییں۔"

یہ تعبیر ایک سخت سزا سے کم نہ تھی، خصوصاً پانچ سالہ لڑکے کے لیے جو اتوار کے دن کی ان شیرینیوں کے بغیر زندگی کا تصوّر نہ کر سکتا تھا۔ لیکن ماں نے، جسے اپنی بیٹی کی غیبی صلاحیت پر مکمّل اعتقاد تھا، اس کے فرمان کو پوری طرح نافذ کیا۔ بدقسمتی سے بس ایک لمحے کی چُوک ہو گئی۔ لڑکے کے حلق میں ایک لڈّو پھنس گیا اور اس کی جان نہ بچ سکی۔

فراؤ فریڈا نے اُس وقت تک کبھی گمان نہ کیا تھا کہ وہ اپنی اس صلاحیت کو روزی کمانے کے لیے استعمال کر سکتی ہے جب زندگی نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور اس نے، ویانا کے شدید جاڑوں میں، اس پہلے مکان کی گھنٹی پر انگلی رکھی جس میں رہنے کو اس کا جی چاہا۔ جب پوچھا گیا کہ وہ کیا کام کر سکتی ہے، تو اس نے یہ سادہ جواب دیا: "میں خواب دیکھتی ہوں۔" ایک مختصر سی وضاحتی گفتگو کے بعد خاتونِ خانہ نے اسے ملازم رکھ لیا۔ تنخواہ اگرچہ معمولی جیب خرچ سے زیادہ نہ تھی، لیکن رہنے کو ایک عمدہ کمرہ اور تین وقت کا کھانا اس کے علاوہ تھا۔ ان کھانوں میں سب سے بڑھ کر ناشتہ تھا، جب گھر کے سب لوگ اپنی اپنی فوری تقدیر سننے بیٹھتے: باپ، جو ایک نفیس شخصیت والا سرمایہ کار تھا؛ ماں، جو رومانی چیمبر موسیقی کی دل دادہ ایک خوش طبع عورت تھی؛ اور دو بچّے جو بالترتیب گیارہ اور نو برس کی عمر کے تھے۔ وہ سب مذہبی خیال کے تھے، اور اس باعث قدیم توہّمات کے زیرِاثر آنے کی حِس رکھتے تھے۔ فراؤ فریڈا کی گھر میں آمد سب کے لیے خوشی کی بات تھی بشرطےکہ وہ ہر روز اپنے خوابوں کے ذریعے ان کی تقدیر کا انکشاف کیا کرے۔

اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، خصوصاً فوری بعد آنے والے جنگ کے برسوں میں، جب حقیقت کسی بھی بھیانک خواب سے زیادہ سنگین تھی۔ ہر صبح ناشتے کی میز پر یہ فیصلہ بلاشرکت غیرے اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا کہ گھر کا ہر فرد اُس روز کیا کرے گا اور کس طرح کرے گا، یہاں تک کہ

رفتہ رفتہ اس کی پیش گو آواز نے گھر کی واحد حاکمانہ آواز کی حیثیت اختیار کر لی۔ گھرانے پر اس کی حاکمیت مطلق تھی؛ خفیف سے خفیف جنبش بھی اس کے حکم کی محتاج تھی۔ باپ کا انتقال میرے ویانا آنے سے ذرا ہی پہلے ہوا تھا اور اس نے موزوں شائستگی سے کام لیتے ہوے اپنی دولت کا ایک حصّہ فراوٗ فریڈا کے نام چھوڑا تھا۔ شرط وہی تھی، کہ جب تک اس کی یہ صلاحیت اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے وہ گھروالوں کی تقدیر کے انکشاف کے لیے خواب دیکھنا جاری رکھے گی۔

ویانا میں مَیں نے ایک مہینا ایک ایسے طالبِ‌علم کے طور پر گزارا جسے کبھی نہ آنے والی رقم کا انتظار تھا۔ مےخانے میں فراوٗ فریڈا کی غیرمتوقع اور کشادہ دست آمد ہماری تنگ مایہ اقلیم میں ایک جشن کی طرح ہوتی تھی۔ ایک رات، جب ہمارے اردگرد بیئر کی تیز بُو پھیلی ہوئی تھی، اس نے آ کر مجھ سے اتنے تیقّن کے ساتھ سرگوشی کی کہ میرے لیے اس کی بات پر توجّہ نہ دینا ناممکن ہو گیا۔

"میں خاص طور پر تمھیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میں نے کل رات تمھیں خواب میں دیکھا ہے،" اس نے کہا۔ "تم اسی وقت ویانا سے چلے جاوٗ اور پانچ سال تک یہاں واپس نہ آنا۔"

اس کا لہجہ اتنا محکم تھا کہ اس نے مجھے اُسی رات روم جانے والی آخری ٹرین میں سوار کرا دیا۔ میں اتنا دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ مجھے اس کے بعد سے رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ میں ایک ایسے سانحے سے بچ نکلا ہوں جو مجھے پیش نہیں آیا۔ میں نے آج تک ویانا میں دوبارہ قدم نہیں رکھا۔

ہوانا والے حادثے سے پہلے فراوٗ فریڈا سے میری ایک بار اَور ملاقات ہوئی تھی۔ بارسِلونا میں اس سے مڈبھیڑ اتنی غیرمتوقع تھی کہ مجھے خاص طور پر پُراسرار معلوم ہوئی۔ یہ وہ دن تھا جب پابلو نیرودا نے، چِیلے کے شہر والپریزو کی جانب اپنے طویل بحری سفر میں ایک وقفے کے دوران، خانہ جنگی کے بعد سے پہلی بار، ہسپانوی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اس نے صبح کا وقت ہمارے ساتھ قدیم کتابوں کی دُکانوں میں، گویا کسی کم یاب شکار کی تلاش میں گزارا۔ اس نے بالآخر اُڑتی ہوئی روشنائی اور پھٹی ہوئی جِلد

والی ایک کتاب خریدی اور اس کے لیے جو رقم ادا کی وہ رنگون میں چیلے کے قونصل خانے کی دو مہینے کی تنخواہ کے برابر تو ضرور رہی ہو گی۔ وہ کسی گٹھیا کے مریض ہاتھی کی طرح رُک رُک کر پُرشور انداز میں چلتا رہا اور اپنی نگاہ کے سامنے آنے والی ہر شے کے اندرونی کل پُرزوں اور کام کرنے کے طریقوں سے بچوں کی سی دل چسپی ظاہر کرتا رہا۔ دنیا اسے ہمیشہ چابی سے چلنے والا ایک بڑا سا مشینی کھلونا دکھائی دی۔

میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں جانا جو نشاۃ الثانیہ کے زمانے کے پوپ کی اکتسابی شکل و صورت سے -- یعنی پُرخوری اور تہذیبِ نفس کے آمیزے سے -- اس قدر قریبی مشابہت رکھتا ہو جتنا یہ شخص جو کسی بھی میز پر بیٹھتا، نہ چاہتے ہوئے بھی، صدرنشیں اور حاکم کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ اس کی بیوی ماتیلد نے اس کے گلے کے گرد ایک بِب سی باندھ دی جو کسی ریستوراں کے نیپکن سے زیادہ حجّام کی دُکان کا ایپرن دکھائی دیتی تھی، لیکن یہ اسے شوربے اور چٹنی میں نہا جانے سے روکنے کا واحد طریقہ تھا۔ اس روز نیرودا نے تین سالم لوبسٹر، کسی سرجن کی سی باریک بیں توجّہ کے ساتھ قطع کر کر کے، کھائے اور اس دوران ہر شخص کی ڈش کو گویا نگاہوں ہی نگاہوں میں نگلتا رہا، یہاں تک کہ ہر پلیٹ میں سے کچھ نہ کچھ لینے کی ترغیب نے اسے مغلوب کر لیا -- گالیسیا کے گھونگے، کنتابریا کی بطخیں، الی کانتے کے جھینگے، کوستابراوا کی سورڈفش -- اور یہ سب اس نے ایسی اشتہا کے ساتھ کیا جسے ہر شخص نے متعدّی پایا۔ تمام وقت وہ، فرانسیسیوں کی طرح، دوسرے خوش مزہ کھانوں کی، خصوصاً چیلے کی ماقبلِ تاریخ شیل فش کی باتیں کرتا رہا جو اسے سب کھانوں سے زیادہ مرغوب تھی۔ کھاتے کھاتے اچانک وہ رُک گیا، اس کے کان لوبسٹر کے انٹینوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور اس نے مجھ سے سرگوشی کی: "میرے پیچھے کوئی شخص بیٹھا ہے جو مجھے متواتر گھور رہا ہے۔"

میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے نظر ڈالی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کے پیچھے، تین میزیں چھوڑ کر، ایک عورت پرانے فیشن کا کینوس کا ہیٹ اور جامنی سکارف پہنے سکون سے بیٹھی آہستہ آہستہ کھانا کھا رہی تھی اور اس کی نگاہ نیرودا پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ بوڑھی اور فربہ ہو گئی تھی لیکن وہ وہی تھی، اپنی پہلی انگلی میں سانپ کی شکل کی انگوٹھی سمیت۔

وہ نیپلز سے اسی کشتی پر چلی آ رہی تھی جس پر نیرودا اپنے کنبے کے ساتھ سفر کر رہا تھا، لیکن سفر کے دوران ان کی آپس میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے اسے ساتھ کافی پینے کے لیے اپنی میز پر بلا لیا اور میں نے اسے دعوت دی کہ وہ، شاعر کو محظوظ کرنے کی خاطر ہی سہی، اپنے خوابوں کے بارے میں گفتگو کرے۔ لیکن شاعر اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھا؛ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ اسے خوابوں کے الوہی ہونے پر قطعاً اعتقاد نہیں۔

"صرف شاعری پیش آگہی کی صلاحیت رکھتی ہے۔" اس نے کہا۔

دوپہر کے کھانے اور رمبلاس کے کنارے کی ناگزیر سیر کے بعد میں جان بوجھ کر فراؤ فریڈا کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ذرا پیچھے رہ گیا تاکہ ہم دوسروں کی سماعت سے باہر اپنی شناسائی کی تجدید کر سکیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ آسٹریا میں اپنی جائیداد بیچ کر پرتگال کے شہر پورتو منتقل ہو گئی ہے اور وہاں ایک ایسے مکان میں رہ رہی ہے جو اس کے الفاظ میں ایک نقلی قلعہ ہے جو ایک اونچی چٹان پر بنا ہوا ہے جہاں سے وہ پورے بحرِاوقیانوس کو، امریکا تک، دیکھ سکتی ہے۔ یہ واضح تھا، اگرچہ اس نے کھل کر کہا نہیں، کہ خوابوں کے ذریعے سے رفتہ رفتہ اس نے اپنے سابقہ ویانیز مالکوں کی تمام جائیداد کی ملکیت حاصل کر لی ہے۔ اس کے باوجود میں متاثر نہ ہوا، صرف اس وجہ سے کہ میں نے ہمیشہ اس کے خوابوں کو پیسا کمانے کی شعوری کوشش خیال کیا تھا۔ میں نے یہ بات اسے بتا بھی دی۔

وہ اپنے مخصوص، مضحکہ اُڑانے والے انداز میں ہنسی۔ "تم ہمیشہ کی طرح ڈھیٹ ہو،" اس نے کہا۔ ہمارے بقیہ ساتھی اب نیرودا کے انتظار میں ٹھہر گئے تھے جو پرندوں کی دُکان میں توتوں سے چیلے کی بول چال کی زبان میں باتیں کرنے لگا تھا۔ جب ہم نے اپنی بات چیت دوبارہ شروع کی تو فراؤ فریڈا نے موضوع بدل دیا۔

"ویسے،" وہ بولی، "تم چاہو تو اب ویانا واپس جا سکتے ہو۔"

اس پر مجھے احساس ہوا کہ ہماری پہلی ملاقات کو تیرہ برس ہو چکے ہیں۔

"حالاں‌کہ تمھارے خواب غلط ہیں، مگر میں کبھی واپس نہیں جاؤں گا،" میں نے اسے بتایا، "کیا پتا؟"

تین بجے میں اس سے جدا ہو کر نیرودا کے ساتھ چلا تاکہ وہ ہمارے

گھر میں اپنا متبرّک قیلولہ کر سکے، جسے اس نے کئی بیحد سنجیدہ ابتدائی رسومات کے بعد شروع کیا جن سے مجھے کسی وجہ سے جاپانیوں کی چائے کی تقریب کا خیال آیا۔ بعض کھڑکیاں کھولی جانی تھیں، بعض بند کی جانی تھیں -- ایک مخصوص درجۂ حرارت بہت ضروری تھا -- اور صرف ایک مخصوص زاویے سے آنے والی مخصوص قسم کی روشنی قابلِ برداشت تھی۔ اور اس کے بعد: انتہائی مکمّل خاموشی۔ نیرودا فوراً ہی سو گیا اور، جیسے بچّے کرتے ہیں، دس منٹ بعد، جب ہمیں اس کی ذرا بھی توقع نہ تھی، اٹھ بیٹھا۔ جب وہ لِونگ روم میں داخل ہوا تو تازہ دم تھا اور تکیے کے غلاف کا مونوگرام اس کے رخسار پر چَھپا ہوا تھا۔

"میں نے خواب دیکھنے والی عورت کو خواب میں دیکھا،" وہ بولا۔

ماتیلد نے اس سے ہمیں اپنا خواب سنانے کو کہا۔

"میں نے دیکھا کہ وہ خواب میں مجھے دیکھ رہی ہے،" وہ بولا۔

"یہ تو بورخیس کی طرح لگتا ہے،" میں نے کہا۔

اس نے اُترے ہوے منہ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "کیا اس نے لکھ دیا ہے؟"

"اگر نہیں لکھا ہے تو ایک نہ ایک دن ضرور لکھے گا،" میں نے کہا۔ "یہ اُسی کی بھول بھلیّوں میں سے ایک ہو گی۔"

اُس سہ پہر چھ بجے نیرودا جوں‌ہی جہاز پر سوار ہوا، اس نے ہم سے الوداعی کلمات کہے، دور کی ایک میز پر جا بیٹھا اور سبز روشنائی والے اُسی قلم سے شعر لکھنے لگا جسے وہ اپنی کتابوں پر دستخط کرتے وقت پھول، مچھلیاں اور پرندے بنانے کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ روانگی کا پہلا اعلان ہوتے ہی ہم نے جہاز میں فراؤ فریڈا کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور بالآخر اسے سیّاحوں کے عرشے پر اس وقت پایا جب ہم مایوس ہو کر تلاش کو خیرباد کہنے کو تھے۔ وہ بھی ابھی ابھی قیلولے سے بیدار ہوئی تھی۔

"میں نے خواب میں تمھارے شاعر کو دیکھا،" اس نے ہمیں بتایا۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر اس سے خواب سنانے کو کہا۔

"میں نے دیکھا کہ وہ خواب میں مجھے دیکھ رہا ہے،" اس نے کہا، اور میرے چہرے پر بےیقینی کا تاثر دیکھ کر گڑبڑا سی گئی۔ "تم کیا سمجھتے ہو؟ کبھی کبھی تمام خوابوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا۔"

میں نے اس کے بعد نہ کبھی اسے دیکھا نہ اس کے بارے میں سوچا۔ پھر میں نے سانپ کی شکل کی اُس انگوٹھی کا ذکر پڑھا جو سمندری حادثے میں ہوٹل ریویٹرا کے قریب ہلاک ہونے والی عورت کی انگلی میں پائی گئی۔ جب چند ماہ بعد ایک سفارتی استقبالیے میں میری ملاقات پرتگالی سفیر سے ہوئی تو میں اس سے اُس کے بارے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

سفیر نے اس عورت کا ذکر جذبے اور بےپناہ ستائش کے ساتھ کیا۔ "تم تصوّر نہیں کر سکتے کہ وہ عورت کتنی غیرمعمولی تھی،" وہ بولا۔ "تم اس پر کہانی لکھنے کی ترغیب کی مزاحمت نہ کر پاتے۔" وہ اسی رو میں بولتا رہا؛ کبھی کبھار درمیان میں کوئی حیران کن تفصیل آتی لیکن اس گفتگو کے ختم ہونے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔

"اچھا، مجھے یہ بتاؤ،" میں نے بالآخر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "کہ وہ کام کیا کرتی تھی۔"

"کچھ بھی نہیں،" اس نے تسلیم و رضا کے انداز میں کندھے جھٹک کر جواب دیا، "وہ بس خواب دیکھتی تھی۔"

شیکسپیئر ان خوش قسمت ادبی شخصیتوں میں سے ہیں جن کا نام صدیوں بعد بھی دنیا کے کونے کونے میں پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر آ جاتا ہے۔ عالمی شہرت اور عظمت کی قیمت یہ ہے کہ پھر ان کی تحریروں کو کوئی پڑھتا نہیں۔ لوگ ان سے صرف رعب کھاتے ہیں۔ مذہبی کتابوں کی مانند ان کی تحریروں کو طاق پر سجا دیا جاتا ہے۔

اس افسوس ناک صورتِ حال کو پیدا کرنے میں ان ثقہ تنقید و تبصرہ نگاروں کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے جو ان عظیم ادیبوں کی نہایت دل چسپ اور دل پذیر تحریروں کے کاندھوں پر اپنے اسی قدر خشک، بےرس اور نصابی طرز پر لکھے ہوے مقالات کے پہاڑ لادتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے شیکسپیئر کے کلام کے ایک نئے انتخاب (فیبر اینڈ فیبر، ۱۹۹۱) میں شیکسپیئر پر ٹیڈ ہیوز کی دل چسپ تحریر پڑھی تو بےاختیار اسے اردو ادب کے قارئین تک پہنچانے کو میرا جی چاہا۔

ٹیڈ ہیوز (Ted Hughes) انگریزی کے نہایت ممتاز ہم عصر شاعر ہیں۔ انیس سو ساٹھ کی دہائی کی ابتدا سے ان کا نام انگریزی شاعری پر چھا گیا تھا۔ ۱۹۶۳ میں ان کی شاعرہ بیوی سلویا پلاتھ (Sylvia Plath) کی الم ناک خودکشی نے ہیوز کے نام کو کچھ عرصے کے لیے گہنا دیا تھا، لیکن بعد میں ان کی کئی اہم کتابیں سامنے آئیں۔ فیبر اینڈ فیبر کا شائع کردہ شیکسپیئر کی شاعری کا تازہ انتخاب انھیں کا مرتب کیا ہوا ہے۔

شیکسپیئر پر زیرِمطالعہ تحریر، جس کا عنوان ہیوز نے صرف "نوٹس" (Notes) رکھا ہے، متعدد اسباب سے قارئین کی دل چسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔ ذاتی طور پر میرے لیے ان اسباب میں سرِفہرست یہ بات ہے کہ ہیوز کی تحریر عام انگریزی تحریروں سے مختلف ہے۔ انگریز ایک نہایت لیے دیے رہنے والی، خاموشی سے مسکرانے، خاموشی سے غصّہ کرنے اور خاموشی سے کام کرنے والی قوم ہے۔ اس کی یہ خصوصیات اسے دوسری یوروپی اقوام اور امریکیوں سے ممیّز کرتی ہیں۔ انگریز جذبات کی شدّت کا تحریر میں کبھی اظہار نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ "ذہنی" ہوتی جا رہی ہے۔ عام طور پر انگریز "ہم انگریز قوم" اور "ہماری انگریزی زبان" جیسی اصطلاحات میں بات ہی نہیں کرتے۔ وہ ہرگز آپ کو نہیں بتاتے کہ انھوں نے کبھی اجتماعی طور پر ذلّت اور دکھ بھی محسوس کیا ہے۔ ہیوز کی تحریر میں جو گرمی ہے وہ سراسر "غیرانگریزی" ہے۔ یہ تو کسی ہندوستانی یا پاکستانی کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ یہ کتنی حیرت خیز بات ہے کہ ہیوز سارے مضمون میں اپنی انگریزیت پر شدّت سے مصر ہے اور یہی بات اسے کسی ایشیائی سے دور لے جانے کے بجائے نزدیک لے آتی ہے!

دوسری طرف ہیوز کی تحریر میں انگریزوں کی خاص روایتی خوبیاں -- باریک بینی اور دوررسی -- صاف جھلک رہی ہیں۔ علاوہ ازیں، انگریزوں کی تحریر میں جو مخصوص عدم ابہام ہے، اور جو کسی بھی دوسرے یوروپی دانش ور کی تحریر میں اس درجہ یقینی نہیں ہو سکتا، ہیوز کی تحریر میں موجود ہے۔ وہ صرف انگریز نہیں، بلکہ انگریز شاعر ہے، اور یہ تحریر ایک ہم عصر شاعر کا اپنے عظیم پیش رو کو خراجِ تحسین ہے۔ اور اس طرح صرف شیکسپیئر ہی نہیں بلکہ ہیوز بھی، غیر ہونے کے باوجود، صرف غیر نہیں بلکہ ہمارا اپنا بھی ہے۔

فہمیدہ ریاض

ٹیڈ ہیوز

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص : فہمیدہ ریاض

شیکسپیئر

شیکسپیئر کی تحریروں پر لکھتے ہوے ہمیں اُن تاریخی عوامل کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو ضرور کہنا چاہیے جنھوں نے ان گراں‌ڈیل دیومالاؤں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ ملکہ مَیری کا جنونی کیتھولِک دور شیکسپیئر کی پیدائش سے سات برس پہلے ختم ہوا تھا، اور اُس کی موت کے تیس برس بعد کچھ عرصے کے لیے نہایت تنگ نظر اور سخت گیر پیوریتانوں (Puritans) کی حکومت قائم ہوئی۔ شیکسپیئر کی زندگی کے باون برس اِن دو ادوار کے درمیان پڑتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انگلستان باطنی طور پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف گویا قلابازی لگا رہا تھا۔ اس دوران میں ملکہ الزبتھ اوّل نے ملک میں بنیادپرست پیوریتانوں سے بھی بڑھ کر سخت گیری سے، باغیوں کو اذیّتیں پہنچا کر اور بےدریغ قتل کر کے ملک میں پروٹسٹنٹ طرزِفکر کی بالادستی قائم رکھی۔ (نہایت دل چسپ بات یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ طرزِفکر میانہ روی کا عَلم بردار تھا، لیکن اسے صرف انتہاپسندی کے ذریعے نافذ کیا جا سکا۔) ۱۶۰۳ میں، ملکہ الزبتھ اوّل کی موت کے وقت، شیکسپیئر تقریباً ۳۹ برس کا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شیکسپیئر کی زندگی کے دو سِروں پر دو قسم کے نظریات کا اثر و نفوذ تھا -- ایک پرانا کیتھولِک نظریہ، جس کی پشت پر نہایت کرّوفر اور افواج و ارمادا وغیرہ تھے، اور دوسرا نوپیوریتانیت (Neo-puritanism)، جو یوروپی سماج سُدھار کے جہادی جنون کی ایک شکل تھی۔ ان دو مذہبی نوعیت کے جنونوں کے ممکنہ ٹکراؤ نے ایک ایسی کثیرالقومی خانہ جنگی کے شدید امکانات پیدا کر دیے تھے

جس سے پیدا ہونے والے خوف اور شدید طوفانی جذبات نے ہر شخص کے لیے ایک نہایت نجی ناٹک کی شکل اختیار کر لی تھی جو ہر انگریز کی گویا عین ناف کے نیچے ایک کٹھالی کی طرح جوش کھا رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، اس پورے دور کی پروازِ تخیّل اپنے انتہائی عروج پر تھی۔

ہماری انگریز قوم کے لیے یہ پورا دور ایک خوفناک باطنی کشمکش سے عبارت تھا۔ الزبتھی دور میں تخلیق ہونے والے ناٹک اسی اندرونی تصادم کے نکاس کا ایک ذریعہ تھے۔ (اس زمانے کے اوّلیں دو ناٹک گھر اُس وقت تعمیر ہوے جب شیکسپیئر بارہ برس کا تھا۔)

ان حالات کا شیکسپیئر پر کس قدر اثر تھا، اس کا اندازہ اس کے تحریر کیے ہوے ڈراموں کی مابعدالنفسیاتی گہرائیوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ بالائی سطح پر ان دو موضوعات کی طرف اشارہ کرنا ہی کافی ہے جو اس کی تحریروں پر چھائے ہوے ہیں۔ ان میں ایک تو خانہ جنگی کی ہولناکی ہے اور دوسرا تخت کے جائز وارث کے قاتل کا کردار جو اس کے ناٹکوں میں ایک ایسے جابر حکمراں کی صورت میں نظر آتا ہے جس کا انجام المناک ہے اور جس کی تقدیر پر مُہر لگ چکی ہے۔

شیکسپیئر کے تخیّل کی نشوونما اور اس کی تحریروں کی تخلیق کے بارے میں ہمارا علم دو تاریخی وقوعات کے باعث نہایت محدود ہو گیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ ہم اُس دور کی روحانی اور ذہنی کیفیت کے بارے میں حیرت انگیز حد تک جاہل ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ الزبتھی دور کے فوراً بعد ملک میں پیوریتانی اقتدار کے زمانے میں ناٹک کی روایت سرے سے ملیامیٹ کر دی گئی تھی۔ پیوریتانیت کے پیروکاروں کو ایک عجب خشک مزاجی کا خبط تھا جس کے تحت وہ ہر قسم کی دل لگی کو قابلِ گردن زدنی گردانتے تھے۔ ۱۶۴۲ سے لے کر ۱۶۶۰ تک انگلستان میں تمام ناٹک گھر باقاعدہ بند کر دیے گئے تھے۔

مذکورہ بالا دو میں سے پہلا تو ایک قابلِ فہم بحران ہے۔ شیکسپیئر کی نسل کے ساتھ ہی قرونِ وسطیٰ کے دور کا اختتام ہوا (جو دراصل اس کے ڈراموں کی جذباتی کائنات تھا)، اور، شیکسپیئر سے عمر میں کچھ بڑے اُس کے ہم عصر سر فرانسس بیکن سے منسوب، عقل و شعور اور سائنس کے دور کا آغاز ہوا جسے روشن خیالی (Enlightenment) کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی سترھویں صدی میں مستحکم ہو گئی، گو اُسے بھی استحکام ایک

پُرتشدّد انقلابی جنگ کے ذریعے حاصل ہوا۔ اس معاشرتی انقلاب کے ساتھ ہی اُس مذہبی کشمکش کا بھی خاتمہ ہو گیا جس نے ہر انگریز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کی جگہ سائنس اور عقل پرستی کے لیے احترام نے لے لی۔ اس وجہ سے مذہبی کشمکش سے پیدا ہونے والی ذہنی، جذباتی اور روحانی دھنک معدوم ہو گئی، اور اس ٹکراؤ کی بھٹّی میں بھڑکتے ہوے شوخ رنگ شعلے بُجھ گئے جو دونوں جانب کا غیظ و غضب بھڑکایا کرتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ شیکسپیئر کی تحریروں میں بھڑکتے ہوے شعلۂ غیظ و غضب کو سمجھنے کے لیے مذہبی ٹکراؤ کی اس گم گشتہ دنیا کو سمجھنا ضروری ہے جس نے فرد کی ذات میں اندر کی جانب جھونک کھا کر اپنا اظہار ڈرامائی قصّہ نویسی میں کیا تھا۔ یہ سمجھنا تو ممکن ہے۔ لیکن جو بات فہم و عقل سے ماورا ہے وہ تو یہ ہے کہ کیتھولِک عقیدے اور پیوریتانیت کے ٹکراؤ نے، اس دوطرفہ پَگلائے ہوے مذہبی جنون کی آپسی کھینچ تان اور لپّاڈگّی نے، یہ تحیّرخیز باطنی روشنی کیوں‌کر پیدا کر دی جس سے شیکسپیئر کی تحریریں جگمگا رہی ہیں، بلکہ جو، کچھ کم خیرگی کے ساتھ، اُس دور کے چند دوسرے ادیبوں کی تحریروں کو بھی منوّر کر رہی ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قطعی قاصر ہیں کہ وہ کون سے پُراسرار عوامل تھے۔ بنیادی اہمیت کے حقائق معدوم ہو چکے ہیں، بلکہ یوں لگتا ہے جیسے انھیں دانستہ ایک ایک کر کے مِٹا ڈالا گیا ہو۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، شیکسپیئر کی وفات کے کچھ عرصے بعد ہی پیوریتانی خشک مزاجی اور لطف اندوزی سے نفرت نے انگلستان میں اقتدار پر ایسا قبضہ جما لیا، اور اربابِ حلّ و عقد کے ذہنوں پر ایسا تسلّط حاصل کر لیا، کہ ناٹک گھر بند کر دیے گئے۔ اس تہذیبی حبسِ دم کا ایک ذیلی نتیجہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ شیکسپیئر کے مرتے ہی اس کے ڈرامے لوگوں کے لیے ناقابلِ فہم ہو گئے۔ اس کے ڈراموں کے تاروپود اپنا مکمّل روحانی نظام رکھتے ہیں۔ اُن کا پُرتقدیس پہلو، اس کے عشقِ حقیقی کا المیہ لوگوں کی نگاہوں سے یکایک اوجھل ہو گیا۔ ایسا ہونا ہی تھا۔ شیکسپیئر کے کرداروں کی شدّتِ احساس ایک مخصوص روحانی ہست و بود سے عبارت ہے۔ اس روحانی وجود نے جوں‌ہی اپنی شناخت کھوئی، شیکسپیئر کے کرداروں کے جذبات کی شدّت کا اُبلتا ہوا لاوا محض وحشیانہ معلوم ہونے لگا۔ لوگ اُس کی زیادہ ذاتی، عشقیہ تحریروں کی آواز سننے سے بھی معذور

ہو گئے۔ وَرڈزورتھ تک نے یہ کہہ دیا کہ شیکسپیئر کی سطور میں ۱۲۷ سے لے کر سب اَن گھڑ، بےقیمت، ابہام زدہ اور بکواس ہے، اور دوسرا کلام بھی اس سے بہت زیادہ اعلیٰ نہیں ہے۔

اِدھر تو شیکسپیئر کی روحانی اور جذباتی کائنات مسمار ہو رہی تھی، اور اس پر طرّہ یہ کہ ناٹک گھر بھی بند کر دیے گئے۔

چودہ برس کے طویل عرصے کے بعد جب نصف فرانسیسی نژاد چارلس اوّل تخت پر بیٹھا اور اس نے تھیٹر کا اَحیا کیا تو اُس کا ذوق انگریزی تھا ہی نہیں۔ وہ تو فرانسیسی کلچر کا دلدادہ تھا۔

چارلس اوّل کے قتل سے پہلے، انگریز عوام کو اس فرانسیسی پسند بادشاہ کے ہر تہذیبی اور تمدّنی اقدام سے جو نفرت تھی، اور کراموِیل کے انگلستان میں جو خصوصیات تھیں وہ بحالی (Restoration) کے زمانے میں کھل کر سامنے آئیں۔ لوگ شیکسپیئر کا جوں‌توں احترام تو کرتے رہے لیکن اس کے ڈراموں کو وحشیانہ، ان کے مکالموں کو بازاری اور ان کی ساخت کو بچکانہ قرار دیا گیا۔ یہ صورتِ حال سرکاری سنسرشپ کی سی تھی۔ یہ کوششیں کی گئیں (اور ایک صدی تک کی جاتی رہیں) کہ شیکسپیئر کے چند قابلِ قبول ڈراموں کو ایسی زبان میں لکھ دیا جائے جو شرفا کی چشم و سماعت پر بار نہ ہو۔ وطن بدری سے لوٹ کر آنے والوں کے لئے بہرحال ۱۶۶۰ سے قبل کا انگلستان ایک ایسا دشمن ملک تھا جس سے وہ برسرِپیکار رہے تھے۔ (نتیجتاً انگریزی شاعری ایک سو تیس برس تک قافیہ بندی کی غلام رہی، جب تک کہ ایک اَور انقلاب نے بلیک اور وَرڈزورتھ کو اس شکنجے سے آزاد نہ کر دیا۔)

اب ہم پر واضح ہوتا ہے کہ اٹھارہ برس تک ناٹک گھروں کو بند رکھنے کا نقصان کس قدر ناقابلِ تلافی تھا۔ یہ محض رِہَرسَل میں آنے والا ایک غیرمعمولی طور پر لمبا وقفہ نہیں تھا، اور نہ صرف تھیٹر کی کم از کم دو نسلوں کا زیاں تھا۔ نئی بندشوں نے اُس ناٹکی روایت کا نام و نشان تک مِٹا ڈالا جس کے تحت شیکسپیئر کے ڈرامے کھیلے گئے تھے اور پروان چڑھے تھے۔ آج ہم کسی صورت یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ ڈرامے اپنے زمانے میں کس طرح کھیلے گئے، کھیل کی رِدم کیا تھی، وقفہ کہاں دیا جاتا تھا، مکالمہ کیسے ادا کیا جاتا تھا، غرض وہ کیا عوامل تھے جنھوں نے اُن پٹی ہوئی یونانی قصّہ کہانیوں کو اپنے وقت کی اس قدر طاقت ور دورمار نفسیاتی میزائلیں بنا دیا

تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر فرانس میں کسی سانحے کے باعث راسین (Racine) کے ڈراموں کی روایت نابود ہو جاتی تو کومیدی فرانسیز (Comedie Francaise) اسے تاابد زندہ نہ کر پاتی۔

شیکسپیئر کے تماشائیوں نے اُس سے جو کڑا مطالبہ کیا تھا وہ کبھی بعد میں دوہرایا نہیں گیا۔ وہ ۱۶۰۸ تک گلوب تھیئٹر میں ناٹک پیش کرتا رہا۔ گلوب تھیئٹر کے ناظرین پورے انگلستان کی آبادی کے نچوڑ کی طرح ہونے تھے۔ ان تماشائیوں میں ایک قدر تو مشترک تھی۔ گو اُس وقت تک مذہبی عداوتیں دبا دی گئی تھیں اور صرف ان کی بدروح باقی تھی، لیکن یہ سب کیتھولِک جبر کے خلاف متّحد تھے اور ذہنی طور پر اس سے حالتِ جنگ میں تھے۔

دوسری جانب یہ واضح طور پر دو قسم کے تماشائی تھے۔ اوپر کی گیلریوں میں اشراف بیٹھتے تھے جو اس قدر ہیبت ناک حد تک تعلیم یافتہ اور شائستگی زدہ تھے جتنا کوئی انگریز کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ نچلی نشستوں پر بڑی تعداد میں عام لوگ بیٹھتے تھے جو اُفتادگانِ خاک تھے، جن میں سے زیادہ تر کو لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ حالات اس اعتبار سے اَور بھی نازک تھے کہ شیکسپیئر کی کامیابی، بلکہ اس کی اور اس کی ناٹک کمپنی کی جسمانی بقا، کا دارومدار دونوں طبقوں پر یکساں تھا۔ نہ صرف شیکسپیئر کی ناٹک منڈلی کا مستقبل، بلکہ خود شیکسپیئر کی دال روٹی بھی، ایک ہی وقت میں اعلیٰ ترین اور ادنیٰ ترین، نہایت شائستہ اور صفاچٹ جاہلوں کی پسندیدگی پر منحصر تھی۔ دوسری طرف، سیاسی مجبوریوں کے باعث، شیکسپیئر اور اس کی ناٹک کمپنی شاہی دربار، امیروں وزیروں اور دیگر اشراف کی سرپرستی کے علیحدہ محتاج تھے۔ جہاں تک عوام النّاس کی بات ہے تو قصّہ مختصر یہ کہ آمدنی کا اصل ذریعہ تو یہی نچلی نشستوں پر بیٹھنے والے لوگ تھے۔

شیکسپیئر کی ساری زندگی اُس دور میں گزری جب لندن کے میونسپل اداروں کے حاکم، پیوریتایت کے زیرِاثر، مستقل ناٹک گھروں کو بند کرانے کے درپے رہے۔ شیکسپیئر کی مالی حالت، بطور جزوی ناٹک گھر کے مالک، جزوی پروڈیوسر، جزوی ہدایت کار، جزوی اداکار، جزوی مینیجر اور جزوی

ڈرامانویس کے، ہمہ وقت عدم تحفّظ کا شکار تھی۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آخر شیکسپیئر تخلیقی مصروفیات کے ساتھ ساتھ سٹریٹ فورڈ کی منڈی میں اناج اور نشاستے کا دھندا کیوں بڑی دلجمعی سے کرتا رہا اور سود پر پیسا بھی چلاتا رہا۔ (دس فیصد سود لیتا تھا۔) ان دنوں انگلستان میں طاعون کی وبا عام تھی۔ طاعون کی وجہ سے ناٹک گھر اکثر ہفتوں، کبھی کبھی مہینوں، بند رہتے۔ گو ایسے میں شیکسپیئر اور اس کی ناٹک منڈلی دوسرے شہروں کے دوروں پر نکل جایا کرتے تھے، لیکن پیوریتانیت کے اثر سے دوسرے شہر بھی محفوظ نہ تھے۔ حد تو یہ ہے کہ ۱۶۰۲ میں اسٹریٹ فورڈ تک میں ناٹک گھر بند کر دیا گیا تھا۔

۱۵۹۲ میں طاعون نے ناٹک گھروں کو جو بند کیا تو لگاتار ۱۵۹۴ تک ناٹک نہیں کھیلے جا سکے۔ اس زمانے میں یوں لگ رہا ہو گا کہ اب ڈرامانویسی گئے وقتوں کی بات بن کر رہ جائے گی۔ یہ غنیمت ہوا کہ ان برسوں میں ساؤتھیمپٹن کے اَرل نے شیکسپیئر کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ شیکسپیئر نے بھی خود کو اس سے وابستہ کر لیا۔ (اس سے منسوب کر کے شیکسپیئر نے دو طویل نظمیں بھی کہیں۔) اس سے شیکسپیئر کی گزربسر کا وقتی انتظام تو ہو گیا لیکن اس کے سانیٹوں سے، جو اسی لارڈ کے لیے موزوں کیے گئے تھے، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس تعلّق کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔

جب ناٹک گھر دوبارہ کھلے تو پیوریتانیت کے کوڑے نے گویا ہنکا ہنکا کر ناٹک منڈلیوں اور اُن سے متعلّق تمام پیشہ وَروں کو کسی نہ کسی طرح دربار کی سرپرستی حاصل کرنے پر مجبور کر دیا۔ دربار کے امرا شوقین تماش بین تھے۔ ۱۶۰۳ میں جب جیمز اوّل تخت نشیں ہوا، اُس وقت تک شیکسپیئر کی ناٹک منڈلی دربار کی خاص الخاص ناٹک منڈلی بن چکی تھی۔ (کچھ عرصے اس کے کارکنوں نے درباری وردی بھی پہنی۔) کم از کم اُس زمانے میں انھیں تھوڑا بہت معاشی تحفّظ حاصل رہا ہو گا۔ لیکن اس سے یہی ثابت ہو سکتا تھا، جس کا شیکسپیئر کو پہلے سے اندازہ تھا، کہ بقا کی خاطر انھیں دربار اور امرا کے ذوق کی لازماً تسکین کرنی ہو گی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ڈرامانگار کو مستقلاً ایک ایسی زبان ایجاد کرنی تھی جسے اشتراکِ طبقات کی زبان کہہ سکتے ہیں، اور ایک ایسا طرزِاظہار تخلیق کرنا تھا جو ادنیٰ ترین اور اعلیٰ ترین کے ذوق کی بیک

وقت تسکین کر سکے۔ شیکسپیئر نے -- موضوع کے لحاظ سے، ایکشن کے لحاظ سے اور زبان کے لحاظ سے -- یہ دو مطالبات اس طرح پورے کیے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس عمل میں یہ ہوا کہ، اپنے ایک نہایت کاروباری مسئلے کو حل کرتے ہوے، اس نے ایک بالکل نئی طرح کا ناٹک اور ایک بےمثال، اچھوتی شعری زبان تخلیق کر ڈالی۔ اور یہ ہوا کہ یہ زبان ایک نہایت جامع اور عمیق روحانی، باطنی اور مخفی وجدان کی زبان بھی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ خاص الخاص انگلستانی، مقبولِ عام میلوڈراما کی زبان بھی۔ یہی تو وجہ ہے کہ اُس دور میں بھی جب کہ انگریز، بہ حیثیت قوم، مختلف وجوہ کے باعث شیکسپیئر کے نورِآگہی (وژن) اور وجدان کو سمجھنے کی حد تک اندھے ہو چکے تھے، وہ شیکسپیئر کو ٹھکرا نہ سکے اور اس کے قدردان ہی رہے۔

یہ بات ہم آسانی سے سمجھ سکیں گے اگر ہم اُن حالات کی تہہ تک پہنچ جائیں جو شیکسپیئر پر اثرانداز ہوے۔ (پھر شیکسپیئر حالات پر اثرانداز ہوا۔) ۱۵۸۰ کی دہائی میں، جب شیکسپیئر نے اداکاری کرنا اور دوسروں کے لکھے ہوے ڈراموں کو دوبارہ لکھنا شروع کیا، الزبتھی تھیئٹر کے آغاز کو دس برس سے زیادہ نہیں ہوے تھے۔ اُس وقت جو ناٹک ہو رہے تھے وہ زیادہ تر اخلاقی یا معجزاتی موضوعات پر مبنی تھے۔ اداکار کٹھ پُتلیوں کی طرح مکالمے بولتے تھے۔ (ناٹکوں کا معیار درحقیقت نہایت گھٹیا تھا۔) یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ڈرامانگار پلاٹس (Plautus) اور سینیکا (Seneca) کے کلاسیکی رومن تھیئٹر کے مقلّد تھے اور فرانسیسی تھیئٹر کی روایت کے بارے میں نسبتاً زیادہ معلومات رکھتے تھے۔ یہ کھچڑی بھی علامتی حد تک اچھا مواد رکھتی تھی لیکن انگریز قوم کی نفسیاتی طلب کی تسکین سے قاصر تھی کہ الزبتھی دورِآخر کے دھماکاخیز دباؤ کو ناٹک کی شکل دے سکے۔ شیکسپیئر (اور اس کی منڈلی) کے سامنے کوئی قابلِ تقلید مثال نہ تھی، کسی پُرعظمت روایت کی جکڑبندی نہ تھی۔ اُس دور کے ڈرامانگاروں کو تختی صاف ملی تھی جس پر وہ جو چاہتے لکھ سکتے تھے۔ ان کا نقدکل فقط کثیرالقومی موضوعاتی تلاش کا جنون تھا اور اس الزبتھی نسل کی سربستہ داخلی زندگی کا وہ آتش فشانی مواد جو اُس وقت تک ورطۂ اظہار

میں نہ آ سکا تھا اور جسے سخت گیر قومی وفاداریوں سے تشکیل شدہ پروٹسٹنٹ ریاست میں رہتے ہوے ریفارمیشن (Reformation) کی باطنی اور نفسیاتی جنگ لڑنی تھی۔

یہ صورتِ حال ایک گھنگھور گھٹا کی مانند تھی۔ سب سے پہلے ان تاریک بادلوں میں بجلی کی طرح چمک کر کون ظاہر ہوا؟ شیکسپیئر؟ نہیں، وہ کرِسٹوفر مارلو تھا۔

شیکسپیئر سے عمر میں دو مہینے بڑا، خاندانی لحاظ سے اس سے کمتر، مگر یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ (شیکسپیئر کے برعکس، جس نے غالباً پندرہ برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے گرامر اسکول سے نام کٹا لیا تھا) کرِسٹوفر مارلو ۱۵۸۷ میں ایک دھماکے سے "تیمور (حصّہ اوّل و دوم)" کے ساتھ انگلستان کے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس فنکار نے ایک ہی داؤ میں نئے عہد کا ڈراما تخلیق کر دیا۔ اس کے ڈراموں کی چکاچوند تحیّرخیز تھی۔ ان ناٹکوں کی رگ و پے میں رواں جذبات اور انگشت بدنداں کر دینے والے ہیرو، لوگوں کی شدید خواہشوں کے بحرِبےکنار کا ایسا ڈرامائی روپ تھے کہ انھوں نے ڈرامے کی ہیئت کے خدوخال متعیّن کر دیے۔ ان ناٹکوں نے جنّت اور دوزخ کے بند دروازے کھول دیے اور الزبتھی دور کی تمام شدّت پسندی کو مباح قرار دے دیا۔ مارلو کی سطور میں اُس آتش فشانی باطنی زندگی کے زیروبم اور ہیبت و شکوہ کو زبان مل گئی۔

مئی ۱۵۹۳ میں مارلو کو قتل کر دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر انتیس برس کی تھی۔ وہ اپنے فن کو ابھی جِلا نہ دے پایا تھا، لیکن اس قلیل مدّت میں اُس نے جو کچھ صرف ودیعت کے بل بوتے پر تخلیق کیا تھا وہ بےمثال قوّت اور انتہائی سادگی کا امتزاج تھا۔ دراصل وہی اشتراکِ طبقات کی زبان تھی۔ اس کے سحر سے کوئی تماشائی دور نہیں رہ سکا تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ اس نئے عہد کے ناٹک میں شیکسپیئر نے کس درجہ کشش محسوس کی۔ وہ ہرگز اس طرح اس نئے ناٹک کی طرف کِھنچا نہ چلا جاتا اگر یہ اس کی اپنی، خاص ذاتی فنکارانہ صلاحیت کے لیے اس قدر موزوں نہ ہوتا۔ یہ بات نہ ہوتی تو اِس ہیئت میں شیکسپیئر کا فن اس قدر بےنظیر اور اچھوتے انداز میں کیوں‌کر بارآور ہو سکتا تھا۔

یقیناً اپنے وقت میں شیکسپیئر کے پُرشکوہ مکالموں کا اثر طلسماتی قسم کا ہوا ہو گا۔ یہ ناظرین کو مبہوت کر کے گویا انھیں کسی اَور ہی دنیا

میں لے جاتے ہوں گے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں طویل مکالمے جس تال، آہنگ اور زیروبم کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں وہ مشرقی تہذیبوں میں کیے جانے والے مذہبی جاپ سے مماثل ہے جس سے سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔

اس قسم کے ناٹک لکھنے کا اثر خود ڈرامانگار پر کیا ہوتا ہو گا، اس طرف تو کسی کی توجّہ ہی نہیں جاتی۔ یاد رہے کہ شیکسپیئر یہ ڈرامے فرصت میں بیٹھ کر تحریر نہیں کرتا تھا۔ اس کو سخت پابندیِ وقت کے ساتھ، مقررہ تاریخ سے پہلے پہلے، ڈرامے لکھ کر پیش کر دینے ہوتے تھے۔ اس نوعیت کا شدید نظم و ضبط کسی حیران کن حد تک سخت اصولوں والی ورزش گاہ کے مماثل ہے، جیسا کہ وہ خود اپنے سانیٹ ۳ میں کہتا ہے:

almost... my nature is subdued
To what it works in, like a dyer's hand

یہاں وہ محض تھیئٹر سے روزی حاصل کرنے کے اپنے کم حیثیت پیشے کی طرف اشارہ نہیں کر رہا۔ یقیناً وہ ان حالات کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے جن میں اسے کام کرنا پڑ رہا تھا؛ جن کا مطلب تھا کہ سہولتیں بس واجبی کے برابر تھیں جب کہ مطالبہ زیادہ سے زیادہ کا تھا۔

شعوری یا غیرشعوری طور پر، ان تمام تقاضوں سے نمٹنے کا ایک طریقہ شیکسپیئر نے بہرحال ایجاد کر لیا۔ ایکشن اور زبان دونوں کے لیے اس نے جو خاص طریقِ کار اختیار کیا اس کا مشاہدہ اس کی تحریروں میں، خصوصاً اس پہلو میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی غیرمعمولی استطاعتِ الفاظ کو اشتراکی طبقات کی زبان میں کس طرح جذب کیا۔ شیکسپیئر نے جو پچیس ہزار الفاظ استعمال کیے ان میں زیادہ تر اس کے ناظرین میں سے بیشتر نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ ان میں متعدّد الفاظ اس نے صرف ایک بار استعمال کیے، یا دو بار استعمال کیے ہوں گے؛ جس کا مطلب ہے کہ یہ الفاظ نہ صرف اجنبی تھے بلکہ اجنبی رہے، تقریباً جیسے کسی غیرملکی زبان کے ہوں۔

اب یہاں ایک سوال تو یہ ہو سکتا ہے کہ آخر شیکسپیئر نے ایسا کیوں کیا۔ زیادہ تر ڈرامانگار تو، اس کے برعکس، ایکشن کی جگہ بنانے کے لیے

زبان کو آسان رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور راسین کی طرح کم الفاظ سے کام چلاتے ہیں تاکہ تاثّر فوری ہو اور خاص و عام کی زبان تک ایک مختصر راستے سے پہنچا جا سکے۔ لیکن اس سے کہیں بڑھ کر تحیّرخیز سوال یہ ہے کہ آخر اس شخص نے یہ کر کیسے لیا۔ آخر یہ ممکن کیوں‌کر ہوا کہ وہ اجنبی الفاظ کا ایک مستقل بہتا ہوا دھارا زبان میں داخل کرتا رہا اور اس کے باوجود اشتراکِ طبقات کی زبان تخلیق کرنے میں شان دار طور پر کامیاب ہوا۔

پہلے سوال کا جواب تو تاریخ میں موجود ہے۔ شیکسپیئر کے دورحیات میں، خصوصاً اس کے ہوش سنبھالنے کے بعد والے برسوں میں، انگریزی کا ذخیرۂ الفاظ اس پیمانے پر وسعت پذیر ہوا کہ اس سے پہلے یا بعد میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ لگتا ہے اُس زمانے میں پورے انگلستان کو فصاحت کا خبط ہو گیا تھا۔ خصوصاً فصاحت میں جدّت کا جنون ہر انگریز کے سر پر سوار تھا۔ اعلی تعلیم یافتہ ادیب دوسری زبانوں، خاص طور پر قابل فخر کلاسیکی زبانوں، کے الفاظ پر باضابطہ قبضہ کر رہے تھے۔ ہر طرف نئے الفاظ کا شور برپا تھا۔ اشراف الفاظ کو برتر طبقاتی علامت کے طور پر کلغیوں کی طرح سجاتے تھے۔ متوسّط طبقہ ان کی نقل کر رہا تھا، اور محنت کش طبقہ اس کی آرزو کر رہا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ الفاظ جمع کرنا ایک مقبولِ عام خبط بن چکا تھا۔ شواہد سے ثابت ہے کہ اس جنون میں گرفتار شیکسپیئر سے بڑھ کر شاید ہی کوئی اَور رہا ہو۔

مگر یہ مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں تھا کہ نیا لفظ لوگ سمجھیں گے کیوں‌کر۔ اشراف تو فوراً لاطینی یا یونانی میں ترجمہ کر کے نئے لفظوں کو معنی پہنا دیں گے، لیکن باقی کے لوگ کیا کریں گے؟

اس مسئلے کا شیکسپیئر نے جو حل نکالا اس کی ارتقائی تاریخ اُس کے کلام میں موجود ہے۔ (حالاں‌کہ اس نے محض ایک مسئلے کے حل سے بڑھ کر فقیدالمثال اور ناقابلِ تقلید ڈرامائی شعریت کی شکل اختیار کر لی۔) شیکسپیئر کا طریقہ نہایت سادہ تھا۔ اس نے وہی کیا جو کوئی بھی شخص ایسا لفظ استعمال کرتے ہوے کرے گا جسے اس کے سننے والے نہ سمجھتے ہوں۔ اس عام اور بےساختہ انسانی عمل کو شیکسپیئر نے نہایت بےنظیر انداز

میں منظّم کر دیا۔ آئیے دیکھیں کہ شیکسپیئر نے کیا کیا۔ مثال کے طور پر ہم "بارھویں شب" *(Twelfth Night)* کی چھ سطریں لیتے ہیں۔

O spirit of love, how quick and fresh art thou
That notwithstanding thy capacity
Receiveth as the sea, nought enters there,
Of what validity and pitch soever
But falls into abatement and low price
Even in a minute.

ان سطور میں تین الفاظ ایسے ہیں جو فرش نشینوں کی سمجھ میں نہ آتے: capacity، validity اور abatement۔ دیکھیے کہ capacity کا لفظ استعمال کرنے کے فوراً بعد وہ کہتا ہے: "جو سمندر کو اپنے اندر سمو لے"، اور اس طرح اس کا مطلب واضح کر دیتا ہے۔ دوسرے لفظ validity کے بعد "اور" شامل کر کے pitch کا لفظ استعمال کرتا ہے جو اُس کے دور میں انگریز نچلے طبقے میں عام طور پر سمجھا جاتا تھا۔ اور آخری دو سطروں میں تو، تکلّف کو بالائےطاق رکھ کر، گویا جُھک کر سامنے بیٹھے ہوؤں کے کان میں کہہ رہا ہے: "اس کا مطلب ہے کم قیمت۔"

یہ تھی شیکسپیئر کی ترکیب۔ اسے آپ اس کے کلام میں جابجا دیکھ سکتے ہیں۔ وہ ہر بار ایک لفظِ معلّیٰ (یعنی لاطینی سے مشتق لفظ) کے فوراً بعد ایک مقامی لفظ استعمال کر کے مصرعے کی تول برابر کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک ہی سانس میں بیک وقت اعلیٰ زبان میں متن بھی پیش کرتا تھا اور ادنی زبان میں اس کا ترجمہ بھی کرتا چلا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ بےساختہ ترکیب، شیکسپیئر کے طولِ کلام میں، ایک وسیع و بسیط نظامِ الفاظ میں ڈھلتی چلی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے نہ صرف ایک نئی زبان خلق کی بلکہ اسے جمہور کی زبان بھی بنا دیا۔

ٹی ایس ایلیٹ نے شیکسپیئر کے لیے کہا ہے کہ اُس کے اندر ایک نہیں بلکہ دو شاعر تھے؛ ایک تو زبان و خیال کو تہہ بہ تہہ جماتا جاتا تھا اور دوسرا دونوں کو سُلجھاتا جاتا تھا۔

شیکسپیئر کو لفظوں سے عشق تھا۔ لفظ اس پر موسلادھار بارش کی

طرح برستے تھے۔ لگتا ہے اُس کے اندر کوئی ایسا مقناطیس تھا کہ لفظ کھنچ کھنچ کر اس سے چمٹ جاتے تھے۔

شیکسپیئر نے جو زبان ایجاد کی وہ انگریزی زبان کے گوشت پوست کے پیکر کی روح ہے۔ شیکسپیئر کے امیجز بھی ایسے ہی ہیں۔ ان کا ظاہر مرصّع اور پُرشکوہ ہے مگر باطن آرائش سے بےنیاز، حقیقت کی کچّی، اصل شکل میں ہے۔ اس کے ڈراموں کا نفسیاتی مواد اس کے کردار کےلی بان جیسا ہے، جو ایک افریقی جادوگرنی اور ایک راکھشس کا جَنا ہے۔ شیکسپیئر کی ایجاد کی ہوئی اشتراکِ طبقات کی زبان میں بھی اُس آدی (ancient) بولی کی روح، ثابت و سالم، سانس لے رہی ہے جو انگریزی زبان کی جڑبنیاد ہے (جس کے لیے ڈاکٹر جانسن نے زنجیریں ڈھالیں، لیکن جو بولے جانے والے ڈائلیکٹ میں آج بھی آزاد ہے اور زندہ ہے)۔ شیکسپیئر جب لاطینی مآخذ کے اشرافی الفاظ استعمال کرتا ہے تو ان کے چوغے اتار کر ان کے نہایت پُرتہذیب بدن کے حصّوں کے ساتھ بڑی بےادبی سے کِھلواڑ بھی کرتا جاتا ہے، کیوں‌کہ ڈائلیکٹ کی روح اجازت طلب نہیں کرتی؛ وہ گستاخ ہوتی ہے۔

شیکسپیئر کی تحریروں کے آخری دور میں ہم زبان اور موضوع، دونوں کی تبدیلی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اس کے دیوہیکل المیوں میں جو تضادات طوفانوں کی طرح ٹکراتے اور تباہیاں لاتے ہیں، ان کی علامتیں گرہ دار ہیں۔ بعد کی تحریروں میں ہیرو، ہیروئن کی جان لینے کے بجائے، اس کے لیے گویا نیا جنم لیتا ہے، بالکل جس طرح وہ اس کے لیے دوبارہ جنم لیتی ہے۔ یہ بدلا ہوا موضوع لفظوں کی دل نشیں موسیقی سے لبریز ہے -- لفظ، جو سادہ ہیں، غیرپیچیدہ ہیں، لیکن معنی اور خوبیِ صوت کے خزانوں سے مالامال ہیں۔ یہ الفاظ اکثر کسی طوفان کا بیان کرتے ہیں -- جو موت اور زائیدگیِ نو کا طوفان ہے -- یا پھولوں کا بیان کرتے ہیں -- جو موت اور زائیدگیِ نو کے پھول ہیں۔ یہ نئی زبان ہمیں سب سے پہلے لیئر اور کارڈیلیا کے ملاپ میں محسوس ہوتی ہے:

No no, no no! Come, let's away to prison.
We two alone will sing like birds i' the cage.

یہ زبان شیکسپیئر کی بعد کی تحریروں میں، عشقیہ مناظر یا عشقیہ موت کے مناظر میں، ملتی ہے، مثلاً "اینٹنی اور کلیوپیٹرا" کے مناظرِ موت میں، لیکن اس کے آخری چار ڈراموں میں یہ اپنے عروج پر ہے۔

شیکسپیئر کے سانیٹوں کی زبان ڈراموں کی زبان سے، حیرت انگیز طور پر، قطعی مختلف ہے۔ ڈراموں کی زبان میں شیکسپیئر کا "مَیں" نہیں تھا۔ وہ "لاآنا" زبان تھی، بلکہ ایسی جسے "کثیرالآنا" کہا جا سکتا ہے، جسے ہر کردار کی علیحدہ مٹّی سے، علیحدہ چاک پر ڈھالا گیا تھا۔ مگر سانیٹ میں، جہاں شاعر محبوب سے براہِ راست مخاطب ہوتا ہے، "مَیں" موجود ہے، اور یہ مَیں شیکسپیئر ہی ہو سکتا تھا۔ سانیٹ میں اس پر پردہ ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔

شیکسپیئر نے، جس نے علم الالفاظ کو مسخّر کر کے گویا مٹّھی میں لے لیا تھا، اپنے سانیٹوں میں کس درجہ سادہ زبان لکھی ہے، کیوں‌کہ وہ کسی بھی ماہرِ الفاظ سے بڑھ کر اس بات سے واقف تھا کہ الفاظ اپنے درست تناظر کے بغیر کچھ بھی نہیں کہتے۔ یوں زیادہ تر لفظوں کو اپنی صداقت ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، کیوں‌کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اشارہ دینے یا پھر اپنے وجود کا اثبات کرنے سے بڑھ کر اَور کچھ نہیں کر سکتے۔ الفاظ کو صبر کے ساتھ یہ شرم ناک حقیقت برداشت کرنی پڑتی ہے کہ بدترین سفید جھوٹ بھی نہایت شان دار لگ سکتے ہیں اور کئی فوری فائدے بہم پہنچا سکتے ہیں۔

اپنی صداقت کے آشکار ہونے تک، سچّے الفاظ کو وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ عمل اور آزمائش انھیں تناظر دیں اور درست ثابت کریں، کہ جیسے یہی دو چیزیں ہر جھوٹ کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیں گی۔

سانیٹ میں ہمارے شاعر کو نہ صرف اپنے دل کی بات کا اظہار کرنا ہے بلکہ اسے ثابت بھی کرنا ہے۔ عشقیہ کلام میں عاشق کو نہ صرف عرضِ حال کرنا ہوتا ہے بلکہ اپنے عشق کو الفاظ کے ذریعے سچ بھی ثابت کرنا ہوتا ہے۔ یہی سانیٹ کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اس بات کی اہمیت کا شیکسپیئر کو اُس وقت بھی بخوبی اندازہ تھا۔ اظہار اور ثبوت کے مسئلے کو فلسفے نے تو کہیں تین سو برس بعد جا کر محسوس کیا، اور پھر وہیں تھم کر رہ گیا۔

عشقیہ کلام میں "دل کی سچّائی" کے اظہار اور اثبات کی اس کے سوا اَور کوئی صورت نہ تھی کہ اُسے ترنّم دے دیا جائے۔ شیکسپیئر نے ایسا ہی کیا۔ اُس کے سانیٹوں کی غنائیت اَن گِنت پڑھنے والوں کے لیے آج بھی نہایت دلکش اور تسکین بخش ہے۔ (گو خود شیکسپیئر کو غنائیت ہمیشہ ایک

مشکوک صفت معلوم ہوتی تھی۔) اب، جب کہ وہ اپنے "دل کا سچ" کہنا چاہتا ہے، تو جیسے گونگا ہو جاتا ہے؛ یہی گونگاپن اُس کے شعر کا موضوع بن جاتا ہے۔

Who is it that says most? Which can say more
Than this rich praise that you are you?

اس کے دل کی سچّائی، اس کی الوہی محبّت، معبد تمام خدایاں (pantheon) کا اصل دیوتا، بنیادی طور پر، لفظ میں نہاں وہ لفظ تھا جو "ایک لفظ بھی نہ بول سکے"۔

شیکسپیئر کے سانیٹوں سے ہمیں اُس کے ڈراموں کے کسی رمز کا سراغ مل سکتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے کہ اس کے ڈراموں کی زبان کی اصل خاصیت کیا تھی۔ ان عظیم الشّان ناٹکوں میں جہاں پُرشکوہ اینٹونی، شاہانہ پیکر اوتھیلو اور پُرغرور کوریولینس عظمت و متانت سے براجمان ہیں، وہ درحقیقت ایسی دنیا ہے جس میں گیلی مٹّی سے لتھڑی درختوں کی جڑوں میں ننّھے منّے پری زاد اور شریر بُھتنے بھی کےلی بان اور آروِن بن کر ناچ رہے ہیں۔ شیکسپیئر کے سانیٹ ہمیں یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ سادہ بیانی اور سادگی اُس کی تحریروں میں باربار کیوں در آتی تھی۔ یہ ایسی سادہ بیانی ہے جو سکوت اور خامشی سے نزدیک ترین ہے۔ اسی لیے کارڈیلیا اپنے "دل کی سچّائی" کے لیے لفظ نہیں ڈھونڈھ پاتی، جب کہ اس کے اردگرد دوسرے لوگ مترنّم الفاظ میں اپنی وفاداری کا اظہار کر رہے ہیں، اور یہ ایسا جھوٹ ہے جو ان سب کو بالآخر برباد کر دینے والا ہے۔

شاید اسی سے شیکسپیئر کی دروں‌بینی اور شفّاف ذہنی کی وضاحت ہوتی ہے۔ "دل کی سچّائی" شیکسپیئر کے لیے ایک ایسی روحانی قدر تھی جس کی مثال صرف اس کراہت سے دی جا سکتی ہے جو وہ جھوٹ کی بابت محسوس کرتا تھا۔ اس کے لفظوں کا ٹھوس پن انھیں دو رویّوں سے مل کر بنا ہے؛ یہی وہ ذرّے ہیں جن سے اس نے اس درجہ تابناک اور لافانی کائنات تعمیر کی۔ اپنےآپ سے سچّا رہنا اس کے لیے ایک مجبوری کی طرح تھا۔ وہ اور کسی طرح کا بن ہی نہیں سکتا تھا۔

Why is my verse so barren of new pride?
So far from variation or quick change,
Why write I still all one ever the same?

اور پھر کہتا ہے:

For as the sun is daily new and old
So is my love still telling what is told.

یہ اندازِ تکلّم اور زبان بےآرائش ہے، سادہ ہے، مگر یہ ڈرائیڈن کی سی سادگی نہیں، ذاتی شعور سے مملو سادگی ہے۔ اس کی نفسیاتی گہرائیاں مُہربند نہیں کر دی گئیں۔ یہ سنگ مرمر کے فرش کی نہیں، گہرے شفّاف پانیوں کی سادگی ہے، جو کھلے ہوے ہیں اور ناگہاں آ لیتے ہیں۔ یہ سادگی اپنے باطن میں حددرجہ چوکنّا ہے، اور یہی ثبوت ہے اس کی مکمّل بےخوفی کا اور زخم کھانے کی پُراستقامت استعداد کا۔

شیکسپیئر کی تحریر کا یہی راز ہے۔

Alas,
I am as true as truth's simplicity.
And simpler than the infancy of truth

فہمیدہ ریاض

کچھ دیے غم آدمی کے

(صغیر ملال کے لیے)

کچھ دیے غم آدمی کے
اور کچھ بس زندگی کے،
بےسبب آلام---
جن کا کوئی بھی مقصد نہ تھا

بےخبر سفّاک پالا
جس میں پھولوں کی پرت گل جائے گی
یا رسیلے پھل میں گھُن
یا ٹوٹتا کوئی رَتن
آنسوؤں کی، اے خدا!
آنسوؤں کی تیز بارش جس سے کچھ حاصل نہیں
ایک نابینا مشیّت، چاک جس کا دل نہیں

کیا کرے گا، اے خدا!
کیا کرے گا تُو سمجھ کر زندگی کو
بےسبب آلام کو اور آدمی کی بےبسی کو

آدمی کی زندگی

زندگی نے سانولی مٹّی سے گوندھا آدمی
پھر جو دیکھا غور سے
آدمی کی جِلد کے نیچے جلا تھا اک چراغ
پُھوٹتی تھی روشنی
زندگی مبہوت ہو کر رہ گئی
محویت سے دیر تک تکتی رہی

جان جب اُس میں پڑی
آدمی نے زندگی کو پُرسکوں آنکھوں سے دیکھا
یوں اچانک آدمی کے رُو بہ رُو جب آ گئی
زندگی کے دل کی دھڑکن تیزتیز
زندگی کا سُرخ چہرہ
زندگی شرما گئی

۲

آدمی گہرے اندھیرے میں کھڑا تھا
اُس کے پیچھے اک دریچہ دُور تک تاروں بھرا تھا

آدمی اُکتا گیا تھا
سوچتا تھا
یہ بھی کیا ہے زندگی!

جب بہت اُکتا گیا
آدمی نے زندگی کو دفعتاً بوسہ دیا
پُرسکوں ہونے سے پہلے زندگی حیراں ہوئی

اُس کے اندر جُڑ گئی پھر کوئی شے ٹوٹی ہوئی
جانے کب سے مضطرب تھی
جیسے عورت ہو کوئی

۳

زندگی سے آدمی کی دوستی ممکن نہیں
آدمی سے اس قدر، مختلف ہے زندگی
زندگی سے وصل کرنا چاہتا ہے آدمی
آدمی گر خود کو بدلے، یا بدل دے زندگی
ختم ہو جائے گی خواہش
جانتا ہے آدمی

آدمی مصروفِ کار
ہاں کبھی جب شام کو
اُس کا دل ہو بےقرار
زندگی سے وصل کو بےاختیار
غور کرتا ہے ہزاروں سال سے
زندگی سے دوستی ممکن نہیں
صرف کر سکتا ہے پیار

۴

آدمی دن بھر اُداس
جا رہا تھا زندگی کے ساتھ ساتھ
رات کے پچھلے پہر
اک سمندر کے کنارے رقص گہ کے سامنے
آدمی نے زندگی کو بےخیالی سے چُھوا
جُھک کے پوچھا:
"رقص کر سکتی ہو تم؟"
سر جُھکا کر زندگی چپ ہو گئی

آدمی کا بُجھ گیا دل سوچ کر
یہ بھی کیسی زندگی ہے، رقص کر سکتی نہیں
روشنی کے دائرے میں سخت چوبی فرش پر
رقص کرتا ہے اکیلا آدمی
رقص گہ کی ایک سُونی میز پر
ڈوبتے دل سے کسی مشروب کو پیتے ہوے
سر جُھکائے زندگی بیٹھی رہی

۵

زندگی نے پھول رکھّے آدمی کے ہاتھ پر
آدمی خوش ہو گیا
زندگی گم ہو گئی
خواب میں چلنے لگی
اک الاؤ کی دہکتی آگ میں جلنے لگی
دوسرے دن
آدمی نے جب نہ پایا اس کو اپنے کام کا
آدمی حیراں پریشاں
زندگی خوش کیوں نہیں؟
زندگی کو کیا ہوا؟
اک صدی تک سوچ میں ڈوبا رہا
آخرش اس نے کہا:
پس کسی نازک توازن سے بنی ہے زندگی
آدمی کی بات سن کر سرد آتش ہو گئی
جلتے جلتے مسکرا دی زندگی

٦

آدمی نے زندگی کے ہونٹ چومے دیر تک
پھر کہا، "یہ ہے سراب"
خودکلامی کر رہا تھا آدمی

سن رہی تھی زندگی
فاصلوں کے خواب میں، زندگی رونے لگی
نارسا تھا آدمی
زندگی بھی نارسا

۷

آدمی خاموش اور پُراعتماد
ڈھالتا ہے کوئی کل فولاد سے

زندگی دُزدیدہ چشم
دیکھتی ہے آدمی کا انہماک
آدمی کے ہاتھ ہیں کتنے حسیں، یہ دیکھ کر
زندگی کے جسم میں ہوتی ہے اک میٹھی کسک
درد کو سینے میں بھینچے
آنکھ موندے زندگی، گھاس پر چلتی ہوئی

گاہے گاہے زندگی کو دیکھتا ہے آدمی
ذہن میں آتا ہے اک اڑتا خیال
بن گئی گر کل نئی
ہو گیا گر کامیاب
زندگی سے لطف کے کچھ سال لے گا
کامیاب و کامران
آدمی سے زندگی کا یوں تو کچھ رشتہ نہیں
زندگی سے حَظ اٹھانے
اپنے گھر میں ڈال لے گا

۸

آدمی نے اک عبادت گاہ توڑی ایک جوڑی
پھر بڑی وحشت سے چیخا

زندگی اک غار میں سوئی ہوئی تھی
شور سن کر جاگ اٹھی
زندگی نے اپنی عریانی کو دیکھا
زندگی ایّام سے
ایّام اس کے دہریہ
کوئی کھٹّی چیز کھانا چاہتی تھی زندگی
بات کوئی بھول جانا چاہتی تھی زندگی
زندگی ایّام سے، ایّام اس کے دہریہ
ہر عبادت گاہ میں ممنوع جن کا داخلہ
آدمی افسوس سے، ہاتھ مَل کر رہ گیا
یہ بھی کیسی زندگی ہے نابکار
آ نہیں سکتی عبادت گاہ میں جو بار بار

۹

آدمی نے ایک کشتی جوڑ کر
رات کے پہلے پہر اوپر اٹھائی جب نظر
تال کے پیچھے جھلکتی تھی سنہری روشنی
زندگی سے کاروباری گفتگو کرتے ہوے
رک گیا کچھ کہتے کہتے آدمی
تال کے آبی درختوں کی جڑوں میں زندگی نے
آنکھ بھر کر آدمی پر کی نظر
اور دیکھا ایک تارا اس کے سر کی سیدھ پر
زندگی اپنے بدن کو بھول کر محوِ نظارہ
آسماں نیلم جَڑا
تال سانسیں بھر رہا
اک درخشندہ ستارے کے تلے
آدمی
سوچ میں ڈوبا ہوا

۱۰

آدمی نے زندگی کو فاصلوں کا خواب سمجھا
جسم جس کا اس کا دل برما گیا

زندگی نے آدمی کو خواب تک سمجھا نہیں
اس کا خاکی ہاتھ تھامے
لمس سے مسحور اس کے
عمر بھر چلتی رہی
بےکراں حیرت سے اس کو دیکھتی اور سوچتی
کون ہے؟
کس قدر تہہ دار تھی دنیا مری
کچھ سبب اور کچھ نتیجے
یہ کہاں سے آ گیا؟
کیا سبب ہے اس کا
اور کیا ہے نتیجہ؟
کچھ نہیں!

اک خزانہ

اچانک راہ چلتے اک خزانہ ہاتھ آتا ہے
بہت حیران ہو جاتے ہیں ہم اور بےقرار

زمیں ششدر، سمیٹیں گے اسے کیوں‌کر
اسے سب سے چُھپا کر گھر میں لانا ہے
کسی تاریک تہہ خانے میں اس کو دفن کر دیں گے
ہمیشہ نصف شب کے بعد تہہ خانے میں جانا ہے
ہم اپنا آنسوؤں سے تربتر چہرہ چھپاتے ہیں

اسے چُھوتے ہیں اپنی انگلیوں سے باربار
مگر آتا نہیں ہے اعتبار
خزانے پاس جب جائیں
خزانے کے نہ ہونے کا زمانہ ساتھ جاتا ہے

یونہی آنکھوں میں رہ رہ کر چمک اٹھتے نہیں آنسو
بہت افسردہ ہو جاتے ہیں وہ اور اشک بار
وہ جن کو خوش نصیبی سے
کسی ویران گھاٹی میں
اچانک راہ چلتے اک خزانہ ہاتھ آتا ہے

فاصلوں میں خواب

بہت فاصلوں میں کوئی خواب ہے
جس کے بارے میں ہم سوچتے تک نہیں
کیوں‌کہ وہ خواب ہے
مگر فاصلوں میں، جہاں ندّیاں ہیں
جہاں ریگزار
جہاں گھاس کے بےکراں مرغزار
جہاں شہردرشہر آلودگی اور غبار
اُنھیں فاصلوں میں
نہ آنکھوں سے اوجھل نہ آنکھوں پہ ظاہر
کسی بوسۂ لب کی سرَبستہ لذّت کی جنّت میں رہتا
مگر پھر بھی ہر لمس سے ماورا
فاصلوں میں
جہاں جانور ہیں
جہاں جانور خون آشام ہیں اور معصوم ہیں
اور جو جانتے ہیں

مسرّت کا، اک دوسرے سے
بلاوجہ رغبت کا خواب
وہ اک نارسیدہ، مگر چشم دیدہ
کوئی خواب
جو ہے بہت فاصلوں میں

یہ عشق نہ تھا آساں

یہ عشق نہ تھا آساں
اے دل کبھی سوچا تھا
اک آگ کا دریا ہے
اور ڈوب کے جانا ہے
اور وقت وہ آنا ہے
بس آگ دکھائی دے
ساحل نہ نظر آئے
چھوٹے سے ترے سچ کی
بےنام مسافت کو
منزل نہ نظر آئے
جب آس نہ ہو کوئی
اور پاس نہ ہو کوئی
لکڑی کی طرح جس دم
جلتا ہو بدن تیرا
کیا پاس ترے ہے کچھ
وہ شے کہ نہ جل پائے
جو بچ کے نکل پائے
آنسو سے بھی ہلکی ہو
اک نور کی جھلکی ہو

سو تو یہی، اے دل، ہے
یہ عشق جو مشکل ہے

دل و شاعر -- ایک مکالمہ

شاعر:

کیوں بھئی،
تجھے اب کیا ہے ہُوا؟
کیوں ڈوبا جاتا ہے اے دل؟
کیوں جینا کیا مرا مشکل؟
تُو جن باتوں پر روتا ہے،
کھول آنکھ، نظر کر چار طرف،
اُن کا تو کسی کو دھیان نہیں،
کیوں چَین تجھے اک آن نہیں؟

دل:

یہ شاعر جو کہلاتے ہیں،
جو یوں‌ہی روتے گاتے ہیں،
سب خلقت کے مزدور ہیں یہ۔
جو بوجھا لوگ اٹھا نہ سکیں،
یہ اپنے سر لے لیتے ہیں۔
ہاں شام ڈھلے، اک نِیم تلے،
مَیلے پلّو کی کھول گرہ،
غم ڈھونے والے دھرتی کا
جب اپنی اُجرت گِنتے ہیں،
کیا چَھن چَھن روپہلے سِکّے
ان کے دامن سے ڈھلتے ہیں۔
ہو جاتی ہے دَھنوان زمیں،

اِس دَھن کا دُوجا جوڑ نہیں۔
مت سمجھ کہ دل دیوانہ ہے،
یہ شاید کوئی خزانہ ہے!

شاعر: (بال نوچ کر)
اب میں اتنی نادان نہیں!
میں کب تک دوں گی ساتھ ترا،
یہ کہنا کچھ آسان نہیں۔
دن ڈوبا، بدلی سب دنیا،
لیکن تُو وہی پرانا ہے۔
مَیں کچھ بھی نہ کہنا چاہتی ہوں۔
آرام سے رہنا چاہتی ہوں۔

دل: (ہنس کر)
اچھا، پھر ہم بھی دیکھیں گے!
فی الحال تو تجھ میں ڈیرا ہے۔
یہ ہاڑ ترے اور ماس ترا،
ان میں ہی مرا بسیرا ہے۔

داروغۂ زنداں

داروغۂ زنداں عریاں ہیں
لیکن ان کو کچھ باک نہیں
یہ کہہ کے تبسّم کرتے ہیں
جو خلعت ہم نے پہنی ہے
اس خلعت کا اعلیٰ ریشم
کم یاب و گراں مایہ ریشم
عامی کو نظر آئے کیوں‌کر

جب اس کی بصارت پاک نہیں

زندانوں کی تاریکی میں
یوں بھی ہوتا ہے کبھی کبھی
اک شوخ کرن در آتی ہے
اور کِھل کِھل ہنستی جاتی ہے
کیا کیا منظر دکھلاتی ہے!

خاکم بدہن

میں عازمِ مےخانہ تھی کل رات کہ دیکھا
اک کوچۂ پُرشور میں اصحابِ طریقت
تھے دست و گریباں
خاکم بدہن، پیچ عماموں کے کھلے تھے
فتووں کی وہ بوچھاڑ کہ طبقات تھے لرزاں
دستانِ مبارک میں تھیں ریشانِ مبارک
موہائے مبارک تھے فضاؤں میں پریشاں
کہتے تھے وہ باہم کہ حریفانِ سیہ رُو
کفّار ہیں بدخُو
زندیق ہیں، ملعون ہیں، بنتے ہیں مسلماں!

ہاتف نے کہا رو کے کہ اے ربِّ سماوات
لاریب سراسر ہیں بجا دونوں کے فتوات
خلقت ہے بہت ان کے عذابوں سے ہراساں
اب ان کی ہوں اموات

حبیب جالب صاحب سے

(ایک تضمین)

شاعری کی بےشمار
اب تک نہیں بدلا وطن
جوں کی توں ہے بدقوارہ گردشِ دوراں ہنوز
اور زمانے کے وہی اطوارِ ناہنجار ہیں
تِس پہ خوش ہونے کی لیکن آپ کو حاجت نہیں
ہم تو چھوٹے ہیں
بڑے تو آپ ہی کہلائیں گے
آپ نے کیا کر لیا قبلہ کہ ہم دکھلائیں فن
پس تو لعنت بر خزاں و بر بہاراں، "یہ چمن
یوں‌ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر
اڑ جائیں گے"

ضمیرالدین احمد

آئینے کی پُشت

میں نے بیگم ساجد کو پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ لان پر مصلّی بچھائے نماز پڑھ رہی تھیں۔ لان کے دونوں کناروں پر کیاریوں میں سرخ، سپید اور زرد گلاب کے پھول ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں انھیں بڑے چاؤ سے دیکھ رہے تھے۔ اور میری نگاہیں ان کی پُشت پر، جو میری جانب تھی، منڈلا رہی تھیں۔ تن زیب کا گلابی کرتا، کرتے کے نیچے اُسی رنگ کی شمیز، شمیز کے نیچے بھرے بھرے بدن کو اپنی تنگ آغوش میں لیے ہوے محرم کی پٹّیاں، اور ڈھکے ہوے کھلے نَم بال جو میری تپتی ہوئی نظروں کو ٹھنڈک پہنچا رہے تھے۔ وہ شاید تھوڑی دیر پہلے ہی نہائی تھیں۔

انھوں نے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ ساجد چلّایا:

"دیکھو تو کون آیا ہے؟"

مگر وہ دنیاومافیہا سے بےخبر اپنے خدا سے خداجانے کیا کیا مانگتی رہیں۔

"اللہ میاں سے ریاض کے لیے ایک عدد اپنے جیسی بیوی بھی مانگ لینا۔"

اُدھر ساجد کی فرمائش ختم ہوئی اور اِدھر انھوں نے دعا کے لیے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرا، اور گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

"آداب بھابی۔"

جواب میں انھوں نے دایاں ہاتھ اپنے تقدّس میں نہائے ہوے چہرے کی طرف اٹھایا اور مسکرا دیں۔ معصوم سی مسکراہٹ، جس میں خیرمقدم بھی تھا اور -- خواہ وہ شوہر کا عزیزترین دوست ہی کیوں نہ ہو -- پہلی بار ملنے کی جھجھک بھی۔

"یہی ہے وہ زمانےبھر کا لفنگا ریاض۔" ساجد نے میرا تعارف کرایا۔

"سن رہے ہیں آپ اپنی تعریف؟" انھوں نے مصلّے پر سے اٹھتے ہوے کہا۔

"ناراض ہے۔" میں نے کہا۔

"بات ہٹی ناراضگی کی۔" وہ آ کر ساجد کے پاس، مجھ سے دور، ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"بھابی، آپ بھی اس کی سی کہنے لگیں؟" میں نے بناوٹی شکایت کے لہجے میں کہا۔

"ابے میری نہیں تو کیا تیری سی کہیں گی؟ بیوی میری ہیں یا تیری؟"

ساجد کے آخری جملے نے ان کے چہرے پر سرخی کے کئی چھینٹے مار دیے۔ انھوں نے دوپٹّے کو بلاسبب ٹھیک کیا اور بولیں، "اچھا، اب انھیں معاف کر دو۔"

"تم سفارش کرتی ہو تو چلو معاف کیا۔"

میں نے طنزاً کہا، "شکریہ؟"

اور وہ دونوں میاں بیوی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ساجد واقعی مجھ سے ناراض تھا۔ وہ مجھے اپنا عزیزترین دوست کہتا اور سمجھتا تھا، لیکن پھر بھی میں اس کی شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ چند مجبوریاں تھیں جن کا ذکر میں نے معذرت اور معافی کے لگاتار تین چار خطوں میں کیا تھا۔ لیکن ساجد نے ان مجبوریوں کو اتنی بھی وقعت نہیں دی تھی کہ ان خطوں کا جواب دیتا۔ اور جب چھ سات ماہ کی طویل اور مسلسل خاموشی کے بعد اس نے جواب بھی دیا تھا تو یہی کہ دوستی کے سامنے کوئی بھی مجبوری نہیں ٹک سکتی۔ اس کے نقطۂ نظر کی صداقت کا احساس مجھے شروع ہی سے تھا، اسی لیے میں نے اس عرصے میں لاہور جا کر بنفسہ اس سے معافی مانگنے کی ہمّت نہیں کی تھی۔ اور اب، جب کہ اس کی شادی کو ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا، میں لاہور اس سے معافی مانگنے نہیں، ایک ذاتی کام سے آیا تھا۔ روانہ ہونے سے قبل میں نے اسے تار تو دے دیا تھا مگر اس کے ایرپورٹ پر موجود ہونے کی امید کم ہی تھی۔ میرا خیال تھا وہ اب بھی ناراض ہو گا۔ مگر وہ ایرپورٹ پر موجود تھا۔

"مگر نہیں،" ساجد ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

میں اور بیگم ساجد، دونوں نے اس سے نظروں ہی نظروں میں پوچھا، "کیا نہیں؟"

"اسے ایسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر کیسے؟" بیگم ساجد نے بڑی سادگی سے پوچھا۔
اور میں نے کہا، "ارشاد؟"
"ایک شرط پر۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ یہ یہاں کم از کم ایک ہفتہ ٹھہرے۔"
"تو کیا یہ دَھیّا چُھونے آئے ہیں؟" بیگم ساجد نے حقیقی تعجب کا اظہار کیا۔
"نالائق کہہ رہا ہے، کل واپس چلا جاؤں گا۔"
"کل؟"
"بات یہ ہے بھابی---" میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوے کہا۔
"کوئی بات وات نہیں سننے کے ہم۔ یا ایک ہفتہ ٹھہرو، یا---"
"اچھا دو دن۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ یہی بات ایرپورٹ سے گھر آتے ہوے کہہ چکا تھا۔
"---یا پھر کبھی شکل نہ دکھانا اپنی۔"
"اوں ہوں۔" اس نے اپنا سر جتنا ہِل سکتا تھا ہلا کر ناک سے آواز نکالی۔
میں نے بیگم ساجد کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھتے ہوے کہا، "واقعی بھابی، میرا جلدازجلد کراچی واپس پہنچنا بہت ضروری ہے۔"
"تم اس کی باتوں میں نہ آنا۔" ساجد نے کہا۔ "اوّل نمبر کا جھوٹا ہے۔"
مگر میری نظروں کی التجا اپنا اثر کر چکی تھی۔
بیگم ساجد بولیں، "اچھا، چار دن۔"
"بول، منظور ہے؟" ساجد نے پوچھا۔
اور میں نے جبرواکراہ کے ساتھ کہا، "منظور!"
واقعی مجھے جلدازجلد کراچی واپس پہنچنا تھا، ورنہ بیگم ساجد کے لو دیتے ہوے بدن پر مرکوز میری نگاہیں تو بس یہی کہہ رہی تھیں کہ بس یہیں رہ جائیے۔

اور آج لگ بھگ پانچ سال بعد مَیں ساجد کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا، اُس بھرے بھرے گنگناتے بدن، اس تقدّس کے غازے تلے سے لو دیتے چہرے، اُن اپنی ہی رقیق روشنی میں تیرتی ہوئی آنکھوں اور اُس مکمّل

طمانیت کو یاد کر رہا تھا جس میں پانچ سال قبل میں نے بیگم ساجد کے سارے وجود کو لپٹا ہوا پایا تھا، اور جس نے میرے منہ زور حوصلے سے، انگشتِ تنبیہ بلند کر کے کہا تھا: بےسود--- بےسود--- بےسود--- وہی بہار کا موسم تھا، وہی ڈرائنگ روم تھا، وہی غروبِ آفتاب کا وقت تھا، وہی آرائش تھی؛ مگر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہر چیز کچھ بدلی بدلی سی ہے۔

میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گیا جس میں سے باغ نظر آ رہا تھا۔ کیاریوں میں ویسے ہی سرخ، سپید اور زرد گلاب کھلے ہوے تھے، مگر ان پر جگہ جگہ برص کے داغ نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی سے ہٹ کر میں کارنس کے سامنے جا کھڑا ہوا جس پر ساجد اور بیگم ساجد کی وہی تصویر اپنی مخصوص جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ مگر میں نے بیگم ساجد کے دائیں رخسار پر انگلی پھیری تو تصویر کے شیشے پر ایک نہایت ہی ہلکی گرد کی تہہ کا پتا چلا، اور اپنی انگلی صاف کرنے کے لیے میں جیب سے رومال نکالنے لگا تو میری نظر گرد کے اس غبار پر پڑی جو سوفے کے ہتّھے سے میرے کوٹ کی آستین نے چُرا لیا تھا۔ میں نے قالین پر زور سے پیر مارا۔ میرا شبہ درست نکلا۔ قالین کو اچھی طرح جھاڑا نہیں گیا تھا۔ اور میں سوفے کی طرف مڑا تو میں نے دیکھا کہ بیگم ساجد دروازے میں کھڑی ہیں۔

"آداب بھابی۔"

ان کے جوابی آداب کا انداز وہی تھا۔ مگر مجھے ان میں ایک نامعلوم سی تبدیلی محسوس ہوئی۔

"آپ کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھیے نا۔"

میں بیٹھ گیا تو وہ بھی بیٹھ گئیں۔

"ساجد کہاں ہے؟"

"وہ راولپنڈی گئے ہیں۔" انھوں نے اپنی قمیص کے دامن کی شکنیں درست کرتے ہوے کہا۔ "آپ نے اطلاع بھی نہیں دی۔"

"بس اچانک آنا ہو گیا۔"

نہ جانے کیوں میں اطلاع دیے بغیر آیا تھا، حالاں‌کہ میرا آنا اچانک نہیں ہوا تھا۔ کم از کم تار تو دے سکتا تھا۔

"کب تک لوٹے گا؟"

"کون؟" پھر خود ہی بولیں، "ساجد صاحب کسی ضروری کام سے گئے

ہیں- پتا نہیں، شاید ایک آدھ دن میں آ جائیں--- یا شاید آج ہی---"

ان کے جملوں کی بےربطی نے مجھے جھوٹ بولنے پر مائل کر دیا- "یعنی اس سے ملاقات نہیں ہو سکے گی؟"

"کیوں؟" انھوں نے پہلی بار مجھ سے نظریں ملا کر بات کی-

"مجھے کل واپس جانا ہے، بشرطےکہ کل میرا کام ہو جائے، جس کی مجھے امید ہے-"

جس کی مجھے قطعی امید نہیں تھی- سچ تو یہ ہے کہ اگر میرا کام تین چار دن میں بھی ہو جاتا تو میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتا- مگر میرے دروغِ مصلحت آمیز نے وہی تاثر پیدا کیا جو میرا منشا تھا- میں نے محسوس کیا کہ یہ سن کر کہ میں صرف ایک روز قیام کروں گا، بیگم ساجد کو ایک گونہ اطمینان ہوا-

"آپ جب بھی آتے ہیں ہوا کے گھوڑے پر سوار-" انھوں نے پہلی بار -- مصنوعی سہی -- شکایت آمیز اپنائیت کا لہجہ اختیار کیا-

"زیادہ ٹھہر کر کروں گا بھی کیا؟ ساجد تو ہے نہیں-"

جواب میں اگر بیگم ساجد وہ کہتیں جو ایسے موقعوں پر اپنے اپنوں سے کہتے ہیں، تو میری راہ میں نہ جانے کتنے چراغ جل اٹھتے- مگر یہ کہنے کے بجائے کہ "اور ہم تو گویا کچھ لگتے ہی نہیں آپ کے"، انھوں نے کہا، "کیا پتا آج ہی آ جائیں- یا کل-"

رات کا کھانا میں نے اکیلے کھایا، کیوں‌کہ بیگم ساجد نے کہلا بھیجا تھا کہ ان کے سر میں درد ہے، وہ کھانا نہیں کھائیں گی- مگر ناشتے کی میز پر وہ موجود تھیں-

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" میں نے ان کے ہاتھ سے کافی کی پیالی لیتے ہوے پوچھا-

"ٹھیک ہے- سر میں درد تھا-"

اور جب وہ توس پر مارملیڈ لگا رہی تھیں تو میں نے پہلی بار غور سے ان کے چہرے کو دیکھا، اور کافی کا گھونٹ میرے حلق میں پھنستے پھنستے رہ گیا- وہ واقعی بدل گئی تھیں- ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں خوب صورت، پُرکشش عورتیں جوانی کی چوٹی سے اترتے وقت بدلی بدلی سی، تھکی تھکی سی نظر آنے لگتی ہیں، بلکہ جن معنوں میں پودوں کی ہریالی میں مناسب کھاد اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے ایک مَٹیالاپن شامل ہو جاتا

ہے- وہ ویسی ہی تھیں جیسا میں نے انھیں پانچ سال قبل دیکھا تھا مگر ان کے رخساروں کی جِلد کے نیچے جلنے والے دِیوں کی لو اب اتنی تیز نہیں تھی- ان کے جسم یا روح میں کہیں چھپا ہوا وہ سورج جس کی کرنیں ان کی پیشانی کو ہمہ وقت منوّر رکھتی تھیں، نصف النّہار سے اتر چکا تھا، یا گہنا گیا تھا- ان آنکھوں کی رقیق چمک گاڑھی ہو چلی تھی- ان کے ہونٹوں کی وہ تپش جسے بغیر چھوئے بھی محسوس کیا جا سکتا تھا، جاڑے کی چاندنی میں تبدیل ہو چلی تھی- ان کے بھرے بھرے بدن کی گنگناہٹ اب میرے جسم کو نہیں سنائی دے رہی تھی- اور حد تو یہ ہے کہ تقدّس کا وہ غازہ جو ہر وقت ان کے چہرے پر مَلا رہتا تھا، پُنچھ گیا تھا-

"یہ حالت کیا بنا رکھی ہے آپ نے؟" میرے منھ سے بےاختیار نکل گیا-

وہ چونک پڑیں-

"کیوں؟ اچھی بھلی تو ہوں-"

ان کے گالوں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی-

میں نے ہمّت کر ڈالی- "یہ تو میری نظروں سے پوچھیے-"

وہ ایک دم لال بھبھوکا ہو گئیں، اور نظریں نیچی کر کے بولیں، "طبیعت ٹھیک نہیں رہتی-"

"تو علاج کرائیے-"

"علاج؟" پھر وہ کئی ثانیوں کے لیے چپ ہو گئیں- اور جب بولیں تو ایسا لگا گویا ابھی ابھی ڈوبے سے تَیری ہوں- "ہاں، علاج کراؤں گی--- آپ اَور توس لیں گے؟"

میں "شکریہ" کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا- "بھابی، میں دن کا کھانا باہر ہی کھاؤں گا-"

انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا، "کیوں؟"

"جن لوگوں سے کام ہے ان کے ساتھ-"

انھوں نے اصرار نہیں کیا-

رات کے کھانے کے بعد میں نے بیگم ساجد کو پکچر چلنے کی دعوت دی، مگر انھوں نے انکار کر دیا-

"کیوں؟"

"میں پکچر بہت کم دیکھتی ہوں-"

"میری خاطر سہی-"

"اصرار نہ کیجیے۔ قطعاً موڈ نہیں۔"
"اچھا چلیے، ذرا چہل قدمی کریں۔"
"جی نہیں چاہ رہا۔"
میں چپ ہو گیا تو انھوں نے پوچھا، "آپ کا کام ہو گیا؟"
میں بھول ہی گیا تھا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ آج میرا کام ہو جائے گا۔

"جی نہیں۔ شاید ایک آدھ دن اور لگ جائے--- ساجد کی کوئی اطلاع؟"
وہ میرے اس وار کے لیے تیار نہ تھیں، چونک پڑیں۔
"جی نہیں۔"
"پنڈی کس کام سے گیا ہے؟"
"پتا نہیں۔ کہہ رہے تھے، ایک ضروری کام ہے۔"
"کتنے دن ہو گئے؟"
"پرسوں ہی تو گئے ہیں۔"
لیکن صبح ناشتے پر جب میں نے گفتگو کا رخ اچانک موڑ کر کہا، "یہ ساجد بہت نالائق ہو گیا ہے۔ آپ نے اسے بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ آٹھ آٹھ دس دس دن کے لیے غائب ہو جاتا ہے بغیر خبر لیے؟"، تو وہ خاموش رہیں اور انھوں نے یہ نہیں کہا کہ "پرسوں ہی تو گئے ہیں"۔
اور جب میں نے دوپہر کے کھانے پر انھیں پھر پکچر چلنے کی دعوت دی تو انھوں نے انکار نہیں کیا۔
اور رات کے کھانے پر انھوں نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میرا کام ہو گیا یا نہیں۔

اور جب پکچر سے واپس آ کر ہم تھوڑی دیر باغ میں بیٹھے اور میں نے ان سے کہا، "بھابی، ایک بات پوچھوں؟"، تو ان کے خاموش اثبات نے کہا، "مجھے معلوم تھا تم پوچھو گے، اور مجھے بتانا ہی پڑے گا۔"
"یہ ساجد---" میں نے سوال اچھی طرح سے تیار نہیں کیا تھا، مگر وہ اسے اس کی ادھوری حالت ہی میں سمجھ گئیں۔
"آپ جانیں، آپ کے دوست ہیں۔"
تھوڑی دیر میں بھی چپ رہا، وہ بھی۔ پھر میں نے پوچھا، "یہ پہلی بار ہے؟"

انھوں نے دُکھ اور تلخی سے چھلکتی ہوئی نظریں میری طرف اٹھائیں،

لمحےبھر مجھے دیکھتی رہیں، پھر بولیں، "نہیں"، اور اٹھ کر کوٹھی کے اندر چلی گئیں۔

دوسرے دن مجھے اس معاہدے پر دستخط کرنے تھے جس کو آخری شکل دینے مَیں لاہور آیا تھا۔ تمام شرائط طے ہو چکی تھیں، مگر میں نے صبح ہی اس فرم کے دفتر پہنچ کر، جس سے معاہدہ کرنا تھا، اعلان کیا کہ معاہدے کی چند شرائط پر میرے رفقائےکار مزید غوروخوض کرنا چاہتے ہیں لہٰذا دو تین روز کی مہلت درکار ہے۔ پھر دن بھر اِدھر اُدھر گھومتا پھرا، اور شام کو بیگم ساجد سے کہا:

"چند ناگزیر حالات کی بنا پر مجھے لاہور میں کئی روز اَور قیام کرنا پڑے گا۔ سوچتا ہوں کسی ہوٹل میں چلا جاؤں۔"

بیگم ساجد نے کیک کا ٹکڑا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "آپ اسے اپنا گھر نہیں سمجھتے؟" ان کے لہجے میں شکایت تھی، مگر مصنوعی نہیں۔

"یہ بات نہیں۔ مگر آپ نے وہ مہمان اور عذابِ جان والا محاورہ تو سنا ہو گا؟"

وہ ہنسنے لگیں۔ ان تین دنوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ہنسی تھیں۔

"سنا ہے۔ مگر آپ اپنے کو مہمان کیوں سمجھتے ہیں؟"

"اچھا، ایک شرط پر آپ کی مزید مہمان نوازی کا بوجھ اپنے کم زور کاندھوں پر اٹھانے کو تیار ہوں۔ نہایت معمولی شرط ہے۔"

"کہیے۔" آج وہ مسکرا رہی تھیں۔

"آپ آج میرے ساتھ کھانا کھائیں گی۔"

"روز ہی آپ کے ساتھ کھاتی ہوں۔"

"نہیں، میری مہمان بن کر، کہیں باہر۔ بولیے، منظور ہے؟"

وہ سنجیدہ ہو گئیں۔

"ریاض صاحب، مجھے سیروتفریح سے زیادہ دلچسپی نہیں۔"

"تبھی تو یہ حالت بنا رکھی ہے اپنی آپ نے؟"

"یہ بات نہیں۔ آپ کو یاد ہو گا، پانچ سال پہلے بھی مَیں گھومنے پھرنے کی کوئی ایسی خاص شوقین نہیں تھی۔"

"اُس وقت کی بات اَور تھی۔"

"کیوں؟"

"اُس وقت آپ اپنےآپ میں گم تھیں۔"

"اور اب؟"

میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور لاجواب ہو گیا۔ وہ اب بھی اپنےآپ میں ہی گم تھیں۔ تو پھر یہ مبہم، مگر اتنی بڑی تبدیلی کیوں؟

"میں نے غلط کہا۔ اُس وقت آپ ساجد میں گم تھیں۔"

"بات تو ایک ہی ہوئی۔"

اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ نہایت بھولی بھالی، سیدھی سادی، معصوم سی عورت ایسی باتیں بھی محسوس کر سکتی ہے جنھیں فکر کے سانچے میں ڈھالا جائے تو ان پر فلسفے کا گمان ہو۔

یکایک ہوا کی لہروں پر سوار، کہیں دور سے مؤذّن کی آواز آئی۔ اور مجھے اُس تبدیلی کا بھید مل گیا جو مَیں بیگم ساجد میں محسوس تو کر رہا تھا مگر جس پر انگلی نہ رکھ پا رہا تھا۔ ان تین دنوں میں مَیں نے انھیں ایک دن بھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔

بیگم ساجد نے ساڑی کا پلّو سر پر ٹھیک کیا۔ میں نے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھا دیا، اور سوچتا رہا کہ اذان ختم ہو جائے تو بیگم ساجد سے پوچھوں کہ انھوں نے نماز کیوں چھوڑ دی۔ پھر خیال آیا کہ شاید یہ سوال نامناسب ہو؛ شاید بالکل نہ چھوڑی ہو، کسی وقتی مجبوری---

"آپ دن بھر کے تھکے ہوے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔" انھوں نے کرسی پر سے اٹھتے ہوے کہا۔ "اتنے میں مَیں غسل کیے لیتی ہوں۔"

غسل؟ میں نے سوچا، نہیں۔ بیگم ساجد نے نماز چھوڑ دی۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

"کون سی بات؟"

"آپ آج رات میرے ساتھ کھانا کھائیں گی یا نہیں؟"

وہ مسکرائیں۔ "میں نے کہا نا، میں غسل کرنے جا رہی ہوں۔"

موم بتّی کی روشنی تانبے کے شمع دان میں سے پھوٹ پھوٹ کر بیگم ساجد کے چہرے پر اندھیرے اجالے کے ٹیڑھے میڑھے نقش بنا رہی تھی اور وہ لقموں کے درمیان رہ رہ کر پاس والی میز پر بیٹھے ہوے ایک امریکن، دو پاکستانی مردوں اور ایک پاکستانی خاتون کی طرف دُزدیدہ نظروں سے دیکھ

رہی تھیں جن کا بلاؤز ان کے سینے کے اُبھار اور اُس کی گولائی کو چھپانے کی مُردہ دلانہ سی کوشش کر رہا تھا، اور جن کی بغلوں کا اندھیرا، ہر بار جب وہ گلاس اپنے ہونٹوں تک لے جاتیں، سرمئی غبار میں تبدیل ہو جاتا۔

"کیا دیکھ رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

انھوں نے کانٹاچُھری پلیٹ پر ٹِکائی، غور سے پاکستانی خاتون کو دیکھا، اور پھر مجھ سے زیادہ شمع دان سے مخاطب ہوئیں:

"پاکستانی عورتیں بھی شراب پیتی ہیں؟"

میں مغربی تہذیب کی ایسے موقعوں کے لیے مقرر کی ہوئی حد کے اندر ہنسا۔

"کیوں نہیں؟ مگر کیا معلوم یہ خاتون شراب پی رہی ہیں یا کچھ اَور۔ لائم جُوس کارڈیل ہو سکتا ہے۔"

"ان کی آنکھیں بتا رہی ہیں۔"

ان کے لہجے کے وثوق نے مجھے چونکا دیا۔

"آپ کو شرابی آنکھ کی پہچان ہے؟"

انھوں نے نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور میرے سوال کا جواب دیے بغیر پوچھا، "آپ بھی پیتے ہیں؟"

میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس کانپ گیا -- بھی؟

"بھی؟"

"جی ہاں- بھی؟"

"اَور کون پیتا ہے؟"

"ساجد صاحب۔ آپ کو تو معلوم ہو گا۔"

"جی نہیں، میرے علم میں قطعاً نہیں--- نہیں، وہ شراب نہیں پیتا۔"

"پہلے نہ پیتے ہوں گے، مگر اب بہت پیتے ہیں۔"

"آپ سے چھپ کر؟"

"اَب میرے اور ان کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔"

"اَب؟"

"پہلے تھا، محبّت کا پردہ۔"

میری خاموشی سوالیہ تھی۔

انھوں نے جواب دیا، "جی ہاں، محبّت کا پردہ۔ جو انھوں نے خود اپنی آنکھوں پر ڈال لیا تھا۔ اور خود ہی ہٹا دیا۔ اچھا کیا۔"

انھوں نے کانٹاچُھری اٹھائی، اور پھر وہی سیدھی سادی عورت نظر آنے لگیں جو اردگرد کی ہر شے سے سہمی سہمی معلوم ہوتی تھی۔

اور میں نے بغیر سوچے سمجھے ان کے اوّلین سوال کے جواب دے دیا۔"جی نہیں، میں نہیں پیتا۔"

میرے جھوٹ کو وہ کانٹے میں پھنسے ہوے مچھلی کے ٹکڑے کے ساتھ خوشی خوشی نِگل گئیں۔

"آپ اچھا کرتے ہیں۔ شراب بہت بُری چیز ہے۔"

باقی کھانا ہم نے خاموشی سے کھایا۔ گھر جاتے ہوے کار میں خاموشی رہی۔ اور جب میرے سدھے ہوے تجربہ کار ہاتھ نے کار سے باہر آتے وقت، بظاہر ان کی مدد کے لیے، ان کا بازو پکڑ کر انھیں سہارا دینا چاہا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کار میں واپس جا رہی ہیں۔ میں نے فوراً اپنا ہاتھ ان کے بازو پر سے ہٹا لیا، اور وہ بغیر میرے سہارے کے باہر آ گئیں۔

لیکن میں نے کہا، "آئیے، تھوڑی دیر باغ میں بیٹھیں"، تو انھوں نے قطعاً تردّد نہیں کیا۔

"لوگ شراب کیوں پیتے ہیں؟" انھوں نے کیاری میں سے ایک پھول توڑتے ہوے پوچھا۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوے سوچا، اب بات ہو ہی جانی چاہیے۔

"ساجد شراب کیوں پیتا ہے؟"

وہ کچھ دیر پھول کو سونگھتی رہیں، پھر بولیں، "مجھے نہیں معلوم۔ تبھی تو آپ سے پوچھا، لوگ شراب کیوں پیتے ہیں؟"

"ساجد اتنے اتنے لمبے عرصے گھر سے غائب کیوں رہتا ہے؟"

"میں نے کبھی پوچھا نہ انھوں نے کبھی بتایا۔"

وہ اس لہجے میں بات کر رہی تھیں جس لہجے میں گھروالیاں نوکروں کو روزمرّہ کی ہدایات دیتی ہیں۔

"یعنی آپ نے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی؟"

"کیا معلوم کرنے کی؟"

"کہ وہ کیوں غائب رہتا ہے؟"

"اس میں کوشش کی کیا ضرورت ہے؟" اور پھول کو دور پھینک کر

انھوں نے کہا، "کیا آپ کو نہیں معلوم؟"

ان کے سوال کی بےساختگی پر مجھ جیسا شخص بھی جھینپ گیا۔ لیکن پھر بھی میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"معلوم تو نہیں۔ ہاں، اندازہ کر سکتا ہوں۔"

"آپ کا اندازہ درست ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "معاف کیجیے، مجھے نیند آ رہی ہے۔ خداحافظ۔"

"خداحافظ!"

میں ان کے کولھوں کے اتارچڑھاؤ کو ان کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد بھی دیکھتا رہا۔

صبح کو نوکر چائے لے کر آیا تو اس کے ساتھ کھلے دروازے میں سے کئی ملی جلی آوازیں در آئیں جن میں بیگم ساجد کی آواز صاف تھی۔

"بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟"

"جی بڑے کمرے میں ہیں۔"

چائے پی کر مَیں بڑے کمرے یعنی ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ نوکر جھاڑپونچھ میں لگے ہوے تھے، مگر بیگم ساجد وہاں نہیں تھیں۔ میں باہر باغ میں گیا۔ بیگم ساجد مالی پر بگڑ رہی تھیں۔

"سارا لان غارت ہوا جا رہا ہے۔ نہ جانے کتنے دن سے پانی نہیں دیا۔ یہ دیکھو! پتّیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اتنا نہیں ہوتا کہ۔۔۔"

"کیا بات ہے بھابی،" میں نے دبےقدموں ان کے پاس پہنچ کر کہا، "آج صبح صبح صفائی کی مہم شروع ہو گئی۔"

وہ مڑیں۔ ان کے چہرے پر غصّے کے آثار مسکراہٹ میں بدل گئے۔

"ان لوگوں پر،" انھوں نے مالی کی طرف اشارہ کرتے ہوے کہا، جو بڑی مستعدی سے کیاریوں میں سے خشک پتّے نکال رہا تھا، "جب تک سختی نہ کی جائے، کوئی کام نہیں کرتے۔ آپ دیکھ رہے ہیں لان کی کیا حالت ہو گئی ہے۔"

مجھے تو جس دن سے آیا تھا اُسی دن سے لان کے چہرے پر برص کے داغ کھٹک رہے تھے۔

"سب کے سب کام چور! ڈرائنگ روم گرد سے اَٹا ہوا ہے، مگر ان سے اتنا نہیں ہوتا کہ ذرا جھاڑپونچھ کر دیں۔"

ان کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں، دوپٹّا سر سے ڈھلکا ہوا تھا جسے

مجھے دیکھ کر انھوں نے جلدی سے ٹھیک نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کے خیرمقدم کی تیاریاں ہوں۔

"کیا ساجد آ رہا ہے؟"

میرے سوال نے جیسے انھیں بلندی سے نیچے ڈھکیل دیا۔

"نہیں تو۔"

ان کی آواز میں کرب و احتجاج دونوں تھے۔ انھوں نے میری طرف دیکھا۔ یہی کرب و احتجاج ان کی آنکھوں میں تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔

نہادھو کر جب میں کپڑے بدلنے لگا تو قمیص کے کالر کا بٹن ٹوٹا پایا۔ کبرڈ کھولا، دوسری قمیص نکالی، جو قمیص پہن چکا تھا اس کے بٹن کھولنے شروع کیے، مگر یکایک رک گیا۔ کھلے ہوے بٹن بند کیے، کمرے سے باہر آیا۔ نوکر سے پوچھا، "بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟" اس نے کہا، "اپنے کمرے میں۔" اپنے کمرے میں واپس گیا۔ آئینے کے سامنے کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، پھر باہر آ کر بیگم ساجد کے کمرے کی طرف بڑھا جو کوریڈور کے دوسرے سرے پر تھا۔ دروازے پر قدرے توقف کر کے میں نے آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں بھابی۔"

بیگم ساجد کا جواب آنے میں دس پندرہ سیکنڈ کی دیر ہوئی۔

"آ جائیے۔"

میں نے آہستہ سے دروازے کی ناب گھمائی اور اندر داخل ہو گیا۔ بیگم ساجد سنگھارمیز کے اسٹول پر بیٹھی تھیں۔ سنگھار تو ابھی شروع نہیں کیا تھا، مگر نہا چکی تھیں۔ رخسار کی جِلد صابن اور تولیے کی رگڑ سے سرخ ہو کر چمک رہی تھی۔

انھوں نے سوالیہ مگر نرم نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"آپ کو تکلیف تو ہو گی بھابی، ذرا یہ---" میں نے انھیں کالر کا وہ حصّہ پکڑ کر دکھایا جہاں بٹن ہونا چاہیے تھا۔

"بٹن ٹوٹ گیا؟ دوسری پہن لیتے۔"

انھوں نے جس انداز سے دوسری کا مشورہ دیا تھا اس میں بٹن لگانے سے انکار کا پہلو نہیں تھا۔

"ہٹی نہیں دوسری۔" میں نے پہلے سے سوچا ہوا جھوٹ بولا۔ "سب کی

سب میلی پڑی ہوئی ہیں۔"

"ارے دھوبی کو دے دی ہوتیں۔"

"دے دوں گا۔ مگر اس وقت تو۔۔۔" میں نے بغیر بٹن کے کالر کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اسٹول پر سے اٹھیں، ایک دراز کھولی، اس میں سے سوئی تاگا اور بٹنوں کا پتّا نکالا، پتّے میں سے ایک بٹن توڑا اور میری طرف بڑھیں۔ مگر نصف قدم کے فاصلے پر رک گئیں۔

وہ شرما کر میرے اور قریب آئیں اور بٹن ٹانکنے لگیں۔ بڑی احتیاط سے کہ کہیں سوئی نہ چبھ جائے، کہ کہیں ان کا ہاتھ میری گردن یا چہرے سے مَس نہ ہو جائے۔ مگر پھر بھی، یا شاید اس قدر احتیاط کی وجہ سے، سوئی چبھ ہی گئی اور میں نے ایک زور کی "سی" کی۔ سوئی ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر جھولنے لگی۔

"کیا ہوا؟" انھوں نے پشیمان ہو کر کہا۔ "چبھ گئی؟"

"جی۔"

"کہاں؟"

"یہاں۔" میں نے گردن کے دائیں حصے پر ایک جگہ ہاتھ رکھ کر بتایا، اور ان کا ہاتھ بےاختیار اسی جگہ پر پہنچ گیا۔ ٹھنڈا ہاتھ، آسودگی بھرا لمس۔ انھوں نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا اور پھر بٹن ٹانکنے لگیں۔ جب ٹانک چکیں، پہلے تو تاگے کو انگلیوں سے توڑنے کی کوشش کی۔ پھر ایک نظر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف ڈالی جہاں نہ انھیں اور نہ مجھے کوئی قینچی نظر آئی۔ اور پھر اپنے چہرے کو میری گردن کے اتنا قریب لا کر کہ میں ان کی گنگنی سانسوں کو محسوس کرنے لگا، انھوں نے دانتوں میں داب کر تاگے کو توڑ دیا۔ اور میں نے ان کے بےترتیبی سے جُوڑا بنے ہوئے بالوں کو اپنے ہونٹوں سے اس طرح چھوا جیسے سخت اُمس میں ننگے بدن کو اچانک ایک بھٹکا ہوا ہَوا کا جھونکا مَس کرتا ہوا نکل جائے۔ وہ نظر کی سی تیزی سے مڑیں اور جا کر دراز میں سوئی تاگا رکھنے لگیں۔ اس عمل میں بہت لگتے تو دس بیس سیکنڈ، مگر وہ کچھ نہیں تو ڈیڑھ دو منٹ دراز کے سامنے کھڑی رہیں۔

"ناراض ہو گئیں؟"

انھوں نے پُھرتی سے دراز بند کی اور مڑیں۔

"ناراض؟ کیوں؟"

ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے ہمّت کر کے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، یہ جاننے کے لیے کہ انھوں نے اپنے بالوں پر میرے ہونٹوں کے لمس کو محسوس کیا یا نہیں، اور کیا تو کیا جانا؛ میں نے جان بوجھ کر ان کے بالوں کو چوما تھا؟ یا یہ لمس اتفاقیہ تھا؟ مگر ان کی اتھاہ آنکھوں میں معصوم لاعلمی کی پَو پھٹ رہی تھی اور شک و شبے کے ان اندھیروں کی جھلک تک نہ تھی جو اس وقت یقیناً میری آنکھوں میں سمٹ آئے ہوں گے۔ کہاں کھلی دراز کے سامنے سوچتا ہوا ساکت بدن اور کہاں یہ دودھ پیتے بچّے کی سی آنکھیں۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بیگم ساجد ایک ایسا تہہ دار شعر ہیں جس کے معنی میرے سمجھ میں آتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔

"آپ نے بتایا نہیں، کیوں؟"

ان کی وہ پو پھٹتے سمے آسمان کا ٹکڑا آنکھیں ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ڈٹی ہوئی تھیں۔

میں نے نظریں نیچی کر لیں۔

"میں نے سوچا--- آپ--- میرے اس طرح--- یعنی اس طرح کوئی کسی خاتون کے بیڈروم میں چلا آئے---"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"کیا کھڑے پیر کا روزہ رکھا ہے آپ نے؟" انھوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

پاس ہی ایک سوفاکرسی پڑی ہوئی تھی، میں اس پر بیٹھ گیا۔

"تو آپ بغیر اجازت آئے تھے میرے بیڈروم میں؟"

"بغیر اجازت نہ سہی--- مگر پھر بھی---"

"پھر بھی کیا؟"

"دیکھیے نا--- اجازت لے کر ہی سہی، مگر کسی کے بیڈروم میں--- خاص کر کسی خاتون کے بیڈروم میں جانا---"

"یہ تو آپ کو دستک دینے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

وہ پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ مسکراہٹ ابھی تک ان کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔

"تبھی تو میں نے سوچا کہ شاید ناراض ہو گئی ہوں گی آپ۔"

"اور اگر میں واقعی ناراض ہو گئی ہوں تو؟"

"تو میں معافی مانگے لیتا ہوں۔"

"بس؟"

"اور جو حکم۔"

"کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ غلطی کو طول نہ دیا جائے؟"

میں نے گھبرا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ تو نہ تھیں، مگر اب ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی کرنیں نہیں مچل رہی تھیں۔

میں آہستہ سے اٹھا، ٹھٹھکا، اور پھر کمرے سے باہر آ گیا۔

ناشتے کا وقت آیا تو میں دردسر کا بہانہ کر گیا۔ مگر انھوں نے نوکر سے کہلا بھیجا کہ کم از کم ایک پیالی کافی تو پی لوں۔ میں نے کہا، "اچھا۔ مگر کافی یہیں لے آؤ۔" وہ کافی لے آیا، مگر ٹرالی کے ساتھ بیگم ساجد بھی چلی آئیں۔

"یہ لیجیے۔" نوکر کے جانے کے بعد انھوں نے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر میری طرف ایسپرو کی دو گولیاں بڑھائیں۔ "انھیں کھا کر تھوڑی سی گرم گرم کافی پی لیجیے۔ تھوڑی دیر آرام کیجیے۔ درد جاتا رہے گا۔"

"میرا درد ایسپرو سے نہیں جاتا۔"

مگر میں نے گولیاں ان کی ہتھیلی پر سے اٹھا لیں۔ اتنی احتیاط سے کہ میری انگلیوں کی پوریں ان کی ہتھیلی کی جِلد سے مَس ہوئیں بھی اور نہیں بھی۔

"پھر کیسے؟"

میں نے سوچا، کہوں، یا نہ کہوں؟ پھر کہہ ہی دیا۔

"دابنے سے۔"

انھوں نے جواب قدرے توقف سے دیا۔

"کھا کے تو دیکھیے۔"

اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

درد گیا تو ایسپرو کی گولیوں ہی سے، جنھیں میں نے ایک کونے میں پھینک دیا تھا، مگر کئی گھنٹے بعد، جب بھوک نے ستانا شروع کیا اور دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آ گیا۔

"اب درد کیسا ہے؟" انھوں نے کھانے کی میز پر پوچھا۔

"کم ہے، بہت کم۔"

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

میرا منہ کی طرف اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔
"بات تو دردسر کی ہو رہی تھی۔"
"آپ نے کہا تھا نا کہ آپ کے سر کا درد دابنے سے جاتا ہے؟"
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اور سر، یا بیویاں دابتی ہیں یا مائیں۔ آپ کی والدہ حیات نہیں، لہذا آپ شادی کر لیں، تاکہ آپ کی بیوی، جب درد ہو، آپ کا سر داب دیا کرے۔"
"نسخہ تو مجرّب بتایا آپ نے۔ مگر مجھ سے کون کرے گا شادی؟"
"کیوں؟ کیا عیب ہے آپ میں؟"
"عیب ہی عیب ہیں۔ اور اوپر سے یہ شکل و صورت!"
"اچھی خاصی تو ہے۔"
اور انھوں نے مجھے ایسے دیکھا گویا میں بَردکھوّے کے لیے آیا ہوں۔
"کالی رنگت۔۔۔"
"سانولی۔" انھوں نے میری بات کاٹ دی۔
"چلیے سانولی سہی۔ سانولی رنگت، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، طباق سا چہرہ، موٹے موٹے ہونٹ۔۔۔"
آلو جیسی ناک، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، پستہ قد۔۔۔
فہرست نامکمّل چھوڑ کر وہ ہنسنے لگیں، کھلکھلا کر۔
"باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے!"
"تو پھر ڈھونڈ دیجیے کوئی۔۔۔ اپنے جیسی۔"
ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"مجھ میں کون سے سرخاب کے پَر لگے ہیں؟"
"یہ تو مجھ سے پوچھیے۔"
ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا، اور میں نے گھبرا کر، کہ کہیں میری بات کا بُرا نہ مان ہو، ٹھٹھول شروع کر دیا۔
"آلو جیسی ناک، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، پستہ قد۔۔۔"
وہ پھر ہنسنے لگیں۔ اور میں نے موقع غنیمت جان کر کہا:
"آج شام کو راوی کی سیر کو چلیں۔ کیا خیال ہے بھابی؟"
"وہاں کیا دھرا ہے!"
"میں کبھی گیا نہیں۔"
"اچھا ہی کیا!"

"تو آپ نہیں جائیں گی؟"

"جی نہیں۔" انھوں نے آخری فیصلے کے انداز میں کہا۔ اور میں اپنا سا منھ لے کر رہ گیا۔

لیکن رات کے کھانے کے بعد انھوں نے خود ہی کہا:

"آئیے چلیں۔"

"کہاں؟"

"راوی کی سیر کو، اور کہاں؟"

میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"اس طرح کیوں گھور رہے ہیں مجھے؟" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

اور میں جواب دیے بغیر گاڑی نکالنے چل دیا۔

راستےبھر بیگم ساجد گاڑی میں میرے پاس بیٹھی بڑے خلوص سے باتیں کرتی رہیں۔ مگر راوی کے کنارے پہنچ کر وہ چپ ہو گئیں، جیسے بجھ سی گئی ہوں۔

"کیا سوچ رہی ہیں بھابی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" انھوں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوے کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

میں انھیں مزید کریدتا، مگر لڑکوں اور لڑکیوں کے اس غول نے جس کے پاس سے تھوڑی دیر قبل ہم گزرے تھے، میری توجّہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ اُس وقت وہ دری پر بیٹھے گپّیں ہانک رہے تھے، مگر اب دھماچوکڑی مچا رہے تھے۔ کوئی چلّا رہا تھا، کوئی چیخ رہا تھا، کوئی ٹھٹّھے لگا رہا تھا، کوئی تالی بجا رہا تھا۔ ایک لڑکی جس کا دوپٹّا ہوا میں لہرا رہا تھا، سرپٹ بھاگتی ہوئی ہمارے پاس سے گزری اور اس کے پیچھے ایک لڑکا۔ لڑکی بیک وقت ہنس بھی رہی تھی اور چیخ بھی۔ اس کا سانس پُھولا ہوا تھا۔ لڑکی نے اچانک لڑکے کو غچّا دیا، لڑکا تیزی میں آگے نکل گیا، لڑکی پَلٹی اور پھر اُسی سمت بھاگی جس طرف سے آئی تھی۔ لڑکا بھی مڑا اور اس کے پیچھے بھاگا، اور پل کی پل میں دونوں سامنے پیڑوں کے جُھنڈ میں غائب ہو گئے۔ اور جب ہم جھنڈ کے پاس سے گزرے تو ہمیں نسوانی احتجاج کی آواز سنائی دی۔ میں نے جھنڈ کی طرف دیکھا اور پھر بیگم ساجد کی طرف۔ وہ بھی چوری چوری جھنڈ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"چلیے، واپس چلیں۔"انھوں نے یکایک مڑتے ہوے کہا۔

راستےبھر وہ میری باتوں کے جواب میں ہوں ہاں سے آگے نہیں بڑھیں۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میرے اور بیگم ساجد کے درمیان، جو میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ لیکن جب گاڑی سے اترتے وقت میں نے بظاہر انھیں سہارا دینے کے لیے ان کا بازو تھاما تو انھوں نے کار میں واپس جانے کی کوشش نہیں کی۔

میں گاڑی گیراج میں بند کر کے آیا تو ان کا کہیں پتا نہ تھا -- نہ باغ میں، نہ ڈرائنگ روم میں، نہ کھانے کے کمرے میں۔ ان کے بیڈروم کا ایرکنڈیشنر چل رہا تھا۔ "سونے چلی گئیں،" میں نے سوچا، اور آ کر لان پر ٹہلنے لگا۔ میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ "مزید وقت ضائع کرنا بےسود ہو گا۔ کراچی واپس جانا چاہیے، کل ہی۔" اور جب سوچ سوچ کر اور ٹہل ٹہل کر تھک گیا تو سگریٹ سلگا کر بید کی کرسی پر دراز ہو گیا۔

نہیں معلوم کب میری آنکھ لگ گئی اور میں کتنی دیر سویا۔ مگر جب جاگا تو دیکھا کہ بیگم ساجد میری کرسی کے پاس کھڑی ہنس رہی ہیں۔ میں ہڑبڑا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ارے آپ تو جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے۔"

وہ اب بھی ہنس رہی تھیں، مگر ان کی آنکھیں چاندنی رات میں دھنسی ہوئی قبروں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

"آنکھ لگ گئی تھی۔"

"معلوم ہے کیسے جگایا آپ کو؟" انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوے پوچھا۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا، "کیسے؟"

"جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر۔"

"مجھے محسوس تو ہوا تھا، جیسے کوئی میرا شانہ ہلا رہا ہو۔"

"پتا ہے کیا بجا ہے؟"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"بارہ بج رہے ہیں۔"

"جی؟"

"لیکن آپ ابھی تک کیسے جاگ رہی ہیں؟"

"نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچا چل کے تھوڑی دیر باغ میں بیٹھوں۔ یہاں آئی تو دیکھا آپ مزے سے خرّاٹے لے رہے ہیں۔"

"میں جاتا ہوں، آپ بیٹھیے۔" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوے کہا۔

جواب میں انھوں نے یہ نہیں کہا، ""چلے جائیے گا، تھوڑی دیر تو اور بیٹھیے۔"

"میں بھی چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "یہاں خنکی سی ہے۔"

انھوں نے واقعی جھرجھری لی۔ حالاں‌کہ خنکی قطعاً نہیں تھی۔

کوریڈور میں اندھیرا تھا۔ میں نے سوئچ آن کیا، اور خداحافظ کہہ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"ارے!"

میں نے سوئچ پر سے ہاتھ ہٹایا اور مڑ کر دیکھا۔ بیگم ساجد کھلے دروازے میں کھڑی کمرے میں کسی چیز کو تعجّب سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے کمرے پر ایک تیز نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی چیز بھی تعجّب انگیز نہ تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"واقعی بہت حرام خور ہو گئے ہیں یہ نوکر!" اب وہ کمرے میں تھیں۔ "بستر تک ٹھیک نہیں کیا آپ کا۔"

حالاں‌کہ حقیقت یہ تھی کہ جب میں دردِسر کا بہانہ کیے بستر پر دراز تھا تو نوکر آیا تھا بستر ٹھیک کرنے، لیکن میں نے اسے منع کر دیا تھا۔

بیگم ساجد جلدی جلدی بستر ٹھیک کرنے لگیں۔ چادر کو اِدھر سے کھینچا، اُدھر سے کھینچا، شکنیں نکالیں اور تکیوں کو تھپتھپایا۔

"چھوڑیے بھی بھابی!" میں نے انھیں کمر سے ذرا اوپر دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوے کہا۔

وہ اوڑھنے کی چادر کو تہہ کر کے پائنتی رکھنے کے لیے جُھکی ہوئی تھیں، جُھکی کی جُھکی رہ گئیں، جیسے منجمد سی ہو گئی ہوں۔ ایک--- دو--- تین--- چار لمحے اسی طرح گزر گئے۔ پھر ان کے جھکے ہوے جسم نے ایک احتجاجی جنبش کی۔ میں نے فوراً اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ مڑیں۔ ان کے ہونٹ بھنچے ہوے تھے، ان کی آنکھوں کی قبریں اور دھنس گئی تھیں، ان کی مٹّھیاں کسی ہوئی تھیں۔ انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا--- اور پھر--- تڑاق!

میرا سارا وجود جَھنجَھنا اٹھا اور میری آنکھوں کے سامنے چنگاریاں ناچنے لگیں۔

وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔

میں نے بڑھ کر ان کا راستا روک لیا۔

ان کا ہاتھ پھر اٹھا---
میں نے ان کا اٹھا ہوا ہاتھ پھر پکڑ لیا۔
انھوں نے ہاتھ چھڑانے کی بہت کوشش کی، مگر بےسود۔
پھر ایک دم انھوں نے اپنی کوشش ترک کر دی۔ ان کا سارا بدن ڈھیلا پڑ گیا اور میں نے ان کے بھرے بھرے بدن سے اپنی آغوش بھر لی۔
پچھلے پہر میری آنکھ کئی بار کھلی، اور ہر بار یہی احساس ہوا کہ گھنٹوں طوفان کے تھپیڑے کھانے کے بعد ساحل پر پڑا بےہوشی کی نیند سے چونک رہا ہوں۔

پہلی بار نیند کا خمار ٹوٹا تو بہت دیر تک غفلت اور بیداری کے درمیان معلّق، ہچکولے کھاتا رہا۔ ایسی حالت میں ہاتھ نے جنبش کی، بیگم ساجد کے بدن سے ٹکرایا۔ جُھولے کی پِینگ بیداری کی طرف بڑھی۔ ہاتھ نے انھیں ٹٹولا۔ وہ چِت لیٹی ہوئی تھیں۔ ہاتھ ان کے سینے پر پہنچ کر بےسُدھ ہو گیا۔ آنکھیں، جو کھلنا چاہ رہی تھیں، پھر ڈوب گئیں۔ مگر نیند کے دوبارہ غلبے سے پہلے میرے ہاتھ نے اتنا بتا دیا کہ وہ جاگ رہی ہیں، سوچ رہی ہیں۔
دوسری بار نیند کا غلبہ کم ہوا تو میرے ہاتھ نے ٹٹول کر مجھے بتایا کہ وہ جگہ جہاں بیگم ساجد لیٹی تھیں، خالی ہے، مگر ابھی تک گرم ہے۔
تیسری بار جب میں سمندر کی اتھاہ گہرائی سے اُبھر رہا تھا تو میرے کانوں میں پانی کی چَھل چَھل، چَھل چَھل آواز آئی۔ میں کچھ دیر اس آواز پر کان لگائے رہا، اور پھر سمندر کی گہرائیوں میں واپس چلا گیا۔
اور چوتھی بار میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا، مگر جس تیزی سے میری آنکھ کھلی تھی اُس سے میں نے اندازہ لگایا کہ صبح ہو گئی یا ہونے والی ہے۔ ٹیبل لیمپ جلا کر گھڑی دیکھی۔ چھ بجنے میں دس منٹ تھے۔ گھڑی کو سائیڈ ٹیبل پر واپس رکھنے لگا تو ایک ہیرپِن پر نظر پڑی جو تکیے کے پاس پڑا سو رہا تھا۔ ہیرپِن کو تکیے کے نیچے رکھا۔ میں نے سونا چاہا، مگر نیند نہیں آئی۔ کوئی احساس باربار نیند روک رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس احساس نے تھکے تھکے درد کی کیفیت اختیار کر لی۔ میں نے اپنے دائیں کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ ایک مقام پر رک گیا۔ یہ مقام دُکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے شبہ ہوا کہ نچلے ہونٹ کے بائیں گوشے میں ایک بہت چھوٹی سی گانٹھ پڑ گئی ہے۔ میری انگلیوں نے مجھے بتایا کہ میرے دائیں گال کا ایک مختصر سا حصّہ سُوج گیا ہے۔

میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کو بولٹ کیا، لائٹ جلائی اور آ کر ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہونٹ، گال اور کندھے، تینوں پر نیل سے پڑ گئے تھے۔

ابھی میں آئینے کے سامنے ہی تھا کہ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی جلدی نائٹ سوٹ پہنا، ڈریسنگ گاؤن لپیٹا، تکیے کے نیچے سے ہیرپن نکالا، اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

میرا خیال تھا آواز کھانے کے کمرے کی طرف سے آئی ہے، مگر بیگم ساجد وہاں نہیں تھیں۔ وہ لِونگ روم میں بھی نہیں تھیں۔ ان کے بیڈروم کا ایرکنڈیشنر نہیں چل رہا تھا، مگر پھر بھی میں نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھیں۔ پھر میں ڈرائنگ روم میں گیا۔ بیگم ساجد کا وہاں بھی پتا نہیں تھا۔ اب ایک ہی جگہ باقی رہ گئی تھی -- باغ۔ میں نے ڈرائنگ روم کا باغ میں کھلنے والا دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔

عین میرے سامنے بیگم ساجد لان پر مصلّی بچھائے نماز پڑھ رہی تھیں، دنیاومافیہا سے بےخبر۔ ان کے آس پاس کیاریوں میں کِھلے ہوئے گلاب کے پھولوں جیسے تازہ چہرے پر تقدّس کی نرم پھوار پڑ رہی تھی، اور اس پھوار کے پیچھے ان کے وجود میں چُھٹتے ہوئے نہ جانے کون سے اناروں کی روشنی رہ رہ کر جھلک جاتی تھی۔

بالکل وہی پانچ سال پہلے والی بیگم ساجد، میں نے سوچا، اور ان کے ہیرپِن کو انگلیوں سے مَسلتا ہوا اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

91-79 X

ذی شان ساحل

نظم

یہ ستارہ جس پرچم کے لیے بنا ہے
اس کا ملک
ایک اجنبی سیّارے پر
طوفانی بارشوں کی نذر ہو گیا ہے
اور ستارے کو، کئی نوری سال تک،
ایک نیا پرچم ڈھونڈنا،
کوئی نیا ملک دریافت کرنا پڑے گا

یہ ستارہ
جس سمندری جہاز کو
راستا دکھانے کے لیے بنا ہے
اس کا جوڑ جوڑ
اسکریپ جمع کرنے والوں نے
اپنے ہتھوڑوں سے الگ الگ کر دیا ہے
اور ستارے کو
اسے پھر سے جوڑنے کے لیے
فولاد کے کارخانے میں
خود کو پگھلانا پڑے گا

یہ ستارہ
جس رات میں چمکنے کے لیے بنا ہے

وہ میری یاد میں
تمھارے آنسوؤں سے بھری ہوئی ہے
ان آنسوؤں سے ہزاروں ستارے بنا کے،
اِس ستارے کو
تمھاری ہتھیلی پہ رکھ کے
پانی میں ڈالا جا سکتا ہے،
بارشوں میں ڈوبے ہوے
ایک ملک کی طرح---

مشرق

جب سورج
مغرب میں
ڈوبنے لگتا ہے
ہماری کوشش ہوتی ہے
تھوڑی سی روشنی کی خاطر
اُسے اپسا کرنے سے روک دیا جائے

شام ہونے سے پہلے
ہم سمندر کے کنارے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں
اور سورج کے آنے کا انتظار کرتے ہیں
وہ آہستہ آہستہ آتا ہے
اور ہمیں جُل دے کر
سمندر میں ڈوب جاتا ہے

ہم واپس آتے ہیں
اور اُن لوگوں سے بچتے بچاتے سو جاتے ہیں
جو سورج کو ہمیشہ

مشرق سے طلوع کرنے کا دعوی کرتے ہیں
مگر اسے ڈوبنے سے
-- ان کے بقول، مغرب میں ڈوبنے سے --
ایک دن بھی نہیں روک سکے

کرِسٹوفر کی مصروفیات

آج صبح
ناشتے سے فارغ ہو کر
کرِسٹوفر کو درزی کے پاس
اور برٹش کاؤنسل جانا ہے
جہاں سے واپسی پر اسے
اپنے نئے گھر کے لیے
پردوں اور فرنیچر کا انتخاب کرنا ہے
دوپہر میں وہ کلاسیکی موسیقی سنے گا اور آرام کرے گا
شام کو ٹینِس کا ایک میچ
اور پھر ایک برِج پارٹی،
جو رات گئے تک چلے گی

کل صبح کرِسٹوفر
کشتیوں کی ریس میں حصّہ لینے والوں میں
بلیزر اور سووینیر تقسیم کرے گا
اور وہاں سے سیدھا
اسٹاک ایکسچینج چلا جائے گا
تھکاہارا کرِسٹوفر
کل دوپہر کو اپنی اِسٹڈی میں
شہاب نامہ پڑھے گا اور آرام کرے گا
شام، اپنی عارضی محبوبہ کے ساتھ،

سمندر کے کنارے گزارے گا
رات کو اُسے
بے‌سہارا بچّوں کے لیے ہونے والے
موسیقی کے پروگرام میں شریک ہونا ہے
جو رات گئے تک چلے گا

پرسوں صبح سویرے
کرِسٹوفر کو اپنے کوکونٹ فارم پر جانا ہے
اور راستے میں
اپنی نئی گارمنٹ فیکٹری پر نظر ڈالنی ہے
دوپہر وہ اپنے فارم کے ساتھ بنے ہوئے
منی زُو میں گزارے گا
اور ستیہ جیت رے کی فلمیں چلائے گا
فارم سے واپسی کے بعد وہ
رات گئے تک
گھر ہی پر رہے گا

میرا خیال ہے
آج اور کل کی طرح
پرسوں بھی ہمارے کرِسٹوفر کا
امریکا دریافت کرنے کا
کوئی ارادہ نہیں

نظم

مجھے جو زہر دیا گیا
اس میں فاسفورس اور پوٹاشیم سلفیٹ کا تناسب
نائٹرِک ایسِڈ سے زیادہ تھا

ایک غیرشاعرانہ فارمولے کو پیشِ نظر رکھتے ہوے
الکحل کے بجائے
سائنائیڈ کی سفّاکی
بطورِخاص شامل کی گئی
زہر دیے جانے کے لیے
شام کے وقت کا تعیّن
اور فیبرون سے تیّارکردہ
آسمانی لباس کا انتخاب
تم نے خود کیا

ساری احتیاط کے باوجود
میرے بچ جانے کی ذمےداری
تمھاری آنکھوں یا
زہریلے محلول میں
رونما ہونے والی
اچانک نامیاتی تبدیلی یا قسمت پر
یکساں طور پر عائد کی جاسکتی ہے

چیزیں اپنی جگہ تبدیل کرنا چاہتی ہیں

اس لفظ کا کیا مطلب ہے
جو تم
محبّت میں شکرگزاری کے لیے
ایک خاص موقعے پر
استعمال کرتی ہو؟

کسی اور جگہ
کسی اور شخص کے سامنے

جذبات کے شدّت سے اظہار کے لیے
کیا اُس لفظ کو اِسی طرح
دوہرایا جا سکتا ہے؟

کیا اسے کہتے ہوے
لفظوں کی ساخت
اور درست ادائیگی کا
ہمیشہ خیال رکھنا ہو گا؟

کیا میری تھوڑی سی بےاحتیاطی
اس کا مفہوم بہت زیادہ تبدیل تو نہیں کر دے گی؟

کیا اس لفظ کے لیے
کسی دوسری زبان میں
کوئی متبادل لفظ
زیادہ مددگار ثابت نہیں ہو گا؟

ان سب باتوں کے باوجود
میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں
شاید واضح نہ ہو سکے،
اس لفظ کی طرح
جو تم کہتی ہو
ایک خاص موقعے پر
محبّت میں شکرگزاری کے طور پر
جب ہمیشہ کی طرح
چیزیں اپنی جگہ تبدیل کرنا چاہتی ہیں

چاقو

ہماری تنہائی سے
ایک لالٹین بنائی جا رہی ہے
جسے طوفانی بارش میں
ہنگامی طور پر استعمال کیا جا سکے گا
یا سونے کی کان میں کام کرنے والوں کو
مفت فراہم کیا جائے گا

ہماری تنہائی سے
ایک بگھی بنائی جا رہی ہے
جسے تفریحی مقامات پر رکھا جا سکے گا
یا ایکسپریس ٹرین کے
پٹری سے اتر جانے کے بعد
خراب موسم میں
روانہ کیا جا سکے گا

ہماری تنہائی سے
ایک پُل بنایا جا رہا ہے
جسے جنگ کے دوران یا بعد میں
ٹینکوں کے گزرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا
یا اچانک
دھماکے سے اڑا دیا جائے گا

ہماری تنہائی سے
ایک چاقو بنایا جا رہا ہے
جسے کاغذ کاٹنے اور سیب تراشنے
کے کام میں لایا جائے گا
اور

زنگ آلود ہو جانے پر
ہمارے دل میں اتار دیا جائے گا

اِس بات کا کہانی سے کوئی تعلّق نہیں ہے

میں وعدہ کرتا ہوں،
کہانی کے بارے میں،
کہ آج شام کے اختتام تک
کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا

تمہاری مسکراہٹ
ستاروں سے زیادہ قیمتی ہے
یا میری آنکھیں بادلوں سے زیادہ خشک۔۔۔

تمہارے شہر کے پاس
کتنے دریا
آبشار کی صورت میں گرتے ہیں
یا میرے ملک کی سرحدیں
کہاں سے شروع ہو کے
کہاں ختم ہو جاتی ہیں
کوئی اپنے خوابوں میں بھی
اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکے گا

میں تاریک راتوں میں
راستوں کی نگرانی کا انتظام
انتہائی سخت کر دوں گا
میں تیز بارش میں ہونے والی گفتگو کو
دیواروں اور کھڑکی کی شیشوں پر

محفوظ کرنے کا بندوبست کروں گا

تمھارے پاس ایک ایسا پھول ہے
جسے چُھونے سے
نیند میں چلنا آسان ہو جاتا ہے
میرے پاس ایک ایسی گھڑی ہے
جو تمھاری یاد میں
ہمیشہ چ رہتی ہے

میں کوشش کروں گا
کسی کو ان چیزوں کی موجودگی کے بارے میں
معلوم نہ ہو
جو کہانی میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں

میں کوشش کروں گا، ہر بار
پہلے سے زیادہ شدّت سے،
اس بات کو بھول جانے کی
جس کا کہانی سے کوئی تعلّق نہیں ہے

خودانحصاری ایک ذاتی عمل ہے

جب کئی برس کی کوشش کے بعد
کسی آدمی سے
ایک پھول بھی توڑا نہ جا سکے
تو اس کے حق کو
محض ایک حکم کے ذریعے
ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کیا جا سکتا
اگر گریفائٹ اور کاربن سے بنی پنسلیں

گلدان میں رکھنا
اسے اچھا لگتا ہو
تو آپ کا کوئی فیصلہ
اس کی عادت تبدیل نہیں کر سکے گا
ہر رات سونے سے پہلے
وہ آپ کے مشورے کے مطابق
اسکرین پرنٹنگ کے بارے میں کوئی کتاب نہیں پڑھے گا
وہ اپنے خوابوں کو کبھی
اکےبانا ترتیب میں نہیں رکھتا
اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے
ایک ایسے ڈپازٹ میں جمع ہیں
جہاں نفع /(نقصان) کی شرح
سب سے زیادہ ہے
اور اس کے دل کا اکاؤنٹ
ایک ایسے بینک میں کھُلا ہوا ہے
جہاں خودانحصاری
ایک ذاتی عمل ہے

اگر آپ

اگر آپ ایک درخت ہیں
تو ظاہر ہے سب سے پہلے
آپ کو بننا چاہیے ایک سایہ دار جگ
اور اگر آپ کے پتّے
کسی خزاں میں گر جائیں
تو آپ کی کوشش ہونی چاہیے
کہ بہار کا پہلا پھول
یا بارش کے بعد نکلنے والی پہلی کونپل

آپ ہی کے حصّے میں آئے

اگر آپ ایک درخت ہوں
اور کوئی آپ کو کاٹ ڈالے
تو افسوس مت کیجیے گا
ہو سکتا ہے آپ کا تعلّق درختوں کے اُس خاندان سے ہو
جس میں ہزاروں برس پہلے کسی پیغمبر نے پناہ لی تھی

اپنے کاٹ لیے جانے پر
افسوس مت کیجیے گا
ہو سکتا ہے آپ سے بنا لی جائے
ایک ایسی کرسی
جس پر بیٹھ کر شاعر
ستاروں بھری نظمیں لکھتے رہیں
یا ایک ایسی میز جس کے سامنے
دوست ایک دوسرے کو یاد کرتے رہیں
یا کوئی ایسا پُل جس پر کھڑے ہو کر لوگ
ہمیشہ ایک دوسرے سے ملنے کے لیے
سکّے پھینکا کریں
یا ایک ایسی سیڑھی جو ہمیں
آسمان تک لے جائے
اور واپس نہ لا سکے

اگر آپ ایک درخت بن جائیں
تو کسی سرکاری عمارت کے احاطے
یا کسی راستے کے درمیان مت آئیے گا
ورنہ ہمیں آپ کو ہٹانے کا بہت افسوس ہو گا
اور آپ سوائے راکھ ہونے کے کچھ نہیں کر سکیں گے

یادگار

اپنے دونوں ہاتھ دل پر رکھ کے
خاموش کھڑے رہیں
اس یادگار کے سامنے
جتنی دیر تک آپ چاہیں
یہاں کوئی تعداد مقرّر نہیں اُن آنسوؤں کی
جو آپ اپنی آنکھوں میں لانا چاہیں
اور اُن پھولوں کی
جو آپ اپنے ساتھ نہ لا سکے
اس یادگار تک آنے کے لیے
آپ پر کوئی پابندی نہیں
اُن راستوں سے گزرنے کی
جو ہر قسم کی ٹریفک کے لیے بند ہیں
یا اُس راستے پر چلنے کی
جو صرف خاص موقعوں پر آنے جانے کے لیے کھلتا ہے
آپ کسی بھی دروازے سے اندر آ سکتے ہیں
کسی بھی کھڑکی سے باہر دیکھ سکتے ہیں
کسی بھی دیوار سے باتیں کر سکتے ہیں
آپ اس یادگار میں،
اس یادگار پر،
اس یادگار کے چاروں طرف
وہ نام تلاش کر سکتے ہیں
وہ نام لکھ سکتے ہیں
وہ نام یاد کر سکتے ہیں
جس کی یاد میں آپ کوئی یادگار نہ بنوا سکے

دفتری کویتا

دفتر کے بعد
میری آنکھیں تمھاری آنکھوں میں
ایک رات کی گہرائی تک
اتر جاتی ہیں
ایک گرم دن سے بچانے کے لیے
تھوڑی دیر کو تمھارے سرد ہاتھ
مجھے تھام لیتے ہیں
جہاں بہت ساری گھڑیاں
تمھارے جانے کا وقت ریکارڈ کر رہی ہیں
تمھیں الوداع کہنے سے پہلے
میرے ہونٹ
کاغذ میں پیوست پن کی طرح
تمھاری ہتھیلی پر ٹھہر جاتے ہیں
ایرپورٹ جانے والی سڑک سے
دفتر کی سیڑھیوں تک
تمھاری یاد اور میرے آنسو
ساتھ ساتھ چلتے ہیں
ٹائپ رائٹر کے بجائے میری انگلیاں
تمھارے ہونٹ چھوتی ہیں
محبّت کی نظم
ایک دفتری کاغذ پر
حرف بہ حرف اتارتے ہوے

سعیدالدین

جو مجسمے ہمیں وراثت میں ملے

جو مجسمے ہمیں وراثت میں ملے
ان کی تکمیل میں
کتنے مرحلے آتے ہیں
پہلے غلاموں کی تاریخ ہوتی ہے
پھر پتھر کو پتھر سے کاٹے جانے کی منصوبہ بندی
پھر مذہبی رسموں کی ادائیگی کے لیے
انسانی خون کا اصراف
اس کے بعد
تاریخ کا رخ موڑنے کے لیے
واقعات کا ایک خاص تسلسل
ایک جابر سلطنت کا قیام
معتوبین کا ایک گروہ
جن میں سے کسی ایک کو
مجسمے بنانے کے لیے
تارک الدنیا ہونا ہو گا

مجسمے دریافت کرنے والے بھی
اس کا سراغ لگانے میں ناکام رہیں گے

تاریخ

سب سے آگے
ایک خچّر پر سوار بادشاہ
اس کے ساتھ پیدل چلتا ہوا خواجہ سرا
جس کی تلوار کے ساتھ
جُھولتا ہوا
کلابتونی کمربند
پیچھے امرا
اور لشکر کے ماہی مراتب
خچّروں پر
کسی معرکے کی تیّاری میں

تاریخ سے گھوڑے کہاں گئے؟
ہم خواجہ سرا کے کلابتونی کمربند
اور جھولتی تلوار کو
مکمّل تاریخ نہیں مانتے

تعارف

ہم سے پوچھیے
ہم کیا چاہتے ہیں
ہم آپ سے بےہودگی کی حد تک
بےتکلّف ہونا چاہتے ہیں
جب آپ کھانس رہے ہوں
تو بےحیائی سے آپ کا مذاق اڑانا چاہتے ہیں
اور چاہتے ہیں
کہ آپ کے سفید پیروں کے درمیان

قالین کے قطعے پر
پیشاب کریں
اب آپ کو
ہماری بےہودگی میں شامل ہونا پڑے گا
اور جاننا ہو گا
کہ آدمی کا اس سے زیادہ مذاق نہیں اڑایا جا سکتا
اور یہ
کہ ننگا کر دیے جانے پر آدمی
دو قدم آگے بڑھ کر
اپنا تعارف کراتا ہے

نشاط

"میں بہت نشاط میں ہوں"
اس نے کہا تھا
اس نے درخواست کی تھی
کہ اسے نہ چھیڑا جائے
اور وہ اسی نشاط میں مر گیا
جس میں وہ تھا
یہ ایک حیوانی مسئلہ ہے
وہ اپنے بھائی کا گوشت کھا رہا تھا
اور ہاں، مقتول
وہ بھی تو نشاط میں تھا

ہم نے انھیں نہیں چھیڑا
ہمیں مان لینا چاہیے
ہم بھی تو نشاط میں تھے

دوسرا

وہ ایک لمحے رُکا
پھر اس نے بھونکنا شروع کر دیا
پھر اس کے ساتھ دوسروں نے بھی
پھر سب چپ ہو گئے
غرّانے لگے
کچھ دیر خاموشی رہی
پھر ان کی سانسیں
ان کی بھونک سے تیز ہو گئیں
اور وہ سب
آنکھیں بند کیے
بھونکنے
جھاگ اڑانے
اور دُم ہلانے لگے
پھر چپ ہو گئے
پھر بھونکنے لگے
یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا
جب تک ان میں سے ہر ایک کو
یہ احساس نہ ہو گیا
کہ دوسرا بھونکنے والا بھی
وہ خود ہے

دروازہ

تاریخ کی کتاب اس نے دوبارہ پڑھی
اور پھر بار بار---
لیکن

شہرپناہ کا دروازہ کھولا کس نے
اس نے جو دروازے کا نگراں تھا
یا کسی جاسوس نے
اس کی دوررس سوچ دیر تک الجھی رہی
معاً کسی نے اس سے کہا:
شہرپناہ کا دروازہ تم نے کھولا
شاید یہ آواز اس کے اندر سے آئی تھی
نہیں!
یہ آواز بھی باہر کی نہ تھی
میں تو اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا
اس کے پاس مضبوط دلیل تھی
لیکن تاریخ خاموش رہی
اس کی طرف دیکھتی رہی
لوگ ہنستے رہے
اس پر تھوکا جاتا رہا
لیکن وہ مصر رہا
کہ وہ تو اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا
اس نے غلطی کی
اگر وہ مان جاتا
یا کم از کم اپنا نام
تحقیقات میں شامل کرا لیتا
تو ایسی موت کبھی نہ مرتا
یہ الگ بحث ہے
کہ تاریخ اسے معاف کرتی
یا نہیں

باغ بنانے کے لیے

میں پرندے بناتا ہوں
اور آسمان،
درمیان میں کسی جگہ پر
زمین
پھر اُگاتا ہوں درخت
اور کِھلاتا ہوں پھول
اس کے باوجود
باغ کی فضا نہیں بنتی
اس کے لیے مجھے پیدا کرنی ہو گی
ہوا
بنانا ہو گا سمندر
اور ڈبونا ہو گا اس میں
ایک جہاز
جس میں میری دنیا ہے
اپنی دنیا
جسے ڈبونے کے لیے
آدمی ساری عمر
سمندر کے سب سے گہرے مقام کی
تلاش میں رہتا ہے

غلام

"صرف میرا آقا جانتا ہے
کیا اس کے دماغ میں ہے"
جوزپالاکوس نے کمال وفاداری سے دوہرایا

اس کا آقا
اس کی بیوی کے پہلو سے اٹھا
اس نے
جوزپالاکوس کو حکم دیا
کہ وہ کھانے کا بندوبست کرے
جب وہ کھانے کا بندوبست کر کے لوٹا
تو جوزپالاکوس
جوزپالاکوس نہیں تھا

چند ثانیوں بعد
وہ اپنے آقا
اور اپنی بیوی
دونوں کا قاتل تھا
اس کے ہاتھ میں اس کے آقا کا سر تھا
اور وہ بڑبڑا رہا تھا:
"صرف میرا آقا جانتا ہے
کیا اس کے دماغ میں ہے"

محسن خاں

زہرا

زہرا نے برقعے کی نقاب ذرا اوپر سرکائی تو وہ چیزیں جو اسے دھندلی دھندلی، بےآب سی نظر آ رہی تھیں، حقیقی ڈِزائنوں اور خوب صورت رنگوں کے ساتھ واضح طور پر نظر آنے لگیں۔ بڑے بڑے سے بارونق پارک، اونچی اور شان دار عمارتیں جن کی بلندی پر نگاہ ڈالنے کے لیے اسے پیچھے کی طرف جھکنا پڑتا، چمکتی ہوئی گاڑیاں جنھیں عورتیں اور لڑکیاں بھی چلا رہی تھیں۔ ایک لڑکی سبک رفتاری کے ساتھ اسکوٹر چلاتی ہوئی زہرا کے رکشے کے قریب سے اس طرح گزر گئی جیسے کوئی چڑیا پروں کو پھیلاتی اور سمیٹتی ہوئی فضا میں گم ہو گئی ہو۔ لڑکی کے تراشیدہ بال شانوں پر اس لو کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے جو تیز ہوا میں چراغ سے اڑ جانے کے لیے بےچین سی ہو جاتی ہے، اور خوب صورت لباس اُس کی پشت پر کسی پرچم کی طرح لہرا رہا تھا۔ زہرا کو ماموں کی بات یاد آ گئی۔ وہ اکثر کہا کرتے،

"اب پہلے والا زمانہ نہیں رہا کہ لڑکیاں چہاردیواری میں قید ہو کر بیٹھ جائیں۔ اب لڑکیاں زندگی کی دوڑ میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کر رہی ہیں۔"

زہرا کی نظروں کے سامنے ایسی انوکھی چیزیں بھی آئیں جو اس نے پہلے نہیں دیکھی تھیں -- ایک خواب سا تھا جس کا تسلسل ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو ایک ایک چیز کو ٹھہر ٹھہر کے، غور سے دیکھنا چاہتی تھی، مگر یہ اس کے اختیار میں کہاں تھا۔

جب رکشا تنگ راستے سے نکل کر کشادہ سڑک پر آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک پارک میں خوب بڑا سا پنکھا لگا ہوا ہے جس کے لمبے لمبے پَر

آہستہ آہستہ چکر کاٹ رہے ہیں۔ اس نے نقاب سے دونوں آنکھیں باہر نکالیں اور خوش گوار حیرت کے ساتھ اس جہازی پنکھے کو دیکھنے لگی۔ پھر جمیل کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر، جوشِ مسرت کے ساتھ، دبے لہجے میں چیخی، "ہائے بھائی جان، اتنا بڑا پنکھا!"

جمیل نے ذرا رخ بدل کر ترچھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ بھائی جان کو میرا اس طرح چہکنا اچھا نہیں لگا۔ اس نے نقاب چہرے پر برابر کی اور سہم کر بیٹھ گئی۔

"بےوقوف!" ذرا توقف کے بعد جمیل نے کہا۔ "تم کو بولنا کب آئے گا؟"

اسے جمیل کی تنبیہ پر ناگواری کا احساس ضرور ہوا مگر اس قدر بھی نہیں کہ وہ حسبِ معمول پرانی توشک کے دھاگوں کی طرح ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری بات نکالتی چلی جاتی اور ذہن کو اس قدر پراگندہ کر لیتی کہ چادر اوڑھ کر لیٹ رہنے کو جی چاہنے لگتا۔ وہ جانتی تھی کہ "بےوقوف" جمیل کا تکیہ کلام ہے۔ غصّے کی تو بات ہی اور تھی، وہ تو اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹوکتے وقت کہہ دیا کرتے، "بےوقوف!" مگر ان کے ادائیگی کے انداز سے اس کا مفہوم بدل جایا کرتا۔ بعض وقت وہ اس خطاب کو کسی تیکھے جملے میں ٹانک دیا کرتے، "تجھے کچھ نہیں آئے گا"، یا "تُو کچھ نہیں سمجھے گی"۔ وہ اس تلخ کلامی اور پیش گوئی پر مسکرا دیتی، لیکن جب تکان میں ڈوبی ہوتی تو ذرا سی تلخی بھی اسے دیر تک بدمزہ کیے رکھتی۔

"میں ہمیشہ بےوقوف اور ناسمجھ رہوں گی،" اس نے سوچا، "ایک جوان لڑکی کو اپنے جوان بھائی سے اس طرح چہک کر بات نہیں کرنی چاہیے۔ اور پھر یہ بھی کوئی بات ہوئی! یہاں تو جانے کتنی چیزیں ایسی ہوں گی جن کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بھائی جان مجھے ان سب چیزوں کے بارے میں کہاں تک بتلائیں۔ یہ تو مجھے خود ہی سوچنا چاہیے کہ کیا بات پوچھنے والی ہے اور کیا نہیں۔ بھائی جان مجھے کتنا ڈانٹتے رہتے ہیں، اس کے باوجود مَیں ایسی حرکتیں کیوں کر بیٹھتی ہوں؟"

بس، میں بھی وہ ایک نادانی کر بیٹھی تھی۔

جس وقت وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی، بےخیالی میں نقاب، چہرے سے اڑ کر پشت کی طرف ہو گئی۔ جمیل نے شاید اس کا کھلا ہوا چہرہ دیکھ لیا تھا؛ اس کی طرف جھک کر سخت لہجے میں

انھوں نے کہا، "کھڑکی کے پاس بیٹھنے کا بہت شوق ہے؟" وہ جمیل کا مدّعا سمجھ گئی تھی لہذا اس نے جلدی سے چہرہ ڈھانپ کر نقاب کا سرا احتیاط سے تھام لیا تھا۔ لیکن چہرہ چھپانے کے باوجود اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ تمام مسافروں کے سامنے بےپردہ ہو گئی ہو۔ ایک تو بس میں وہ اکیلی برقعےوالی تھی، جس کی وجہ سے سب لوگ کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دوسرے یہ خیال کہ "اگر بھائی جان کی بات کسی نے سن لی ہو گی تو وہ کیا سوچے گا۔ یہی نا کہ بھائی جان مجھے اسی طرح ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہوں گے، اور یہ کہ میں برقع مارے باندھے اوڑھتی ہوں۔ مجھے اس کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے بیٹھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" کھڑکی میں شیشہ بھی نہیں تھا جسے کھینچ کر وہ ہوا کو اندر آنے سے روک دیتی۔ جمیل کی اس گھڑکی کے بعد وہ دیر تک تاسف اور شرمندگی کے احساس میں مبتلا رہی، لیکن پھر ہمیشہ کی طرح یہ کیفیت اس کے باطن میں کہیں چھپ گئی۔

"اسے wind turbine کہتے ہیں،" جمیل نے کہا۔ "اس سے بجلی بنتی ہے۔"

اس نے کنکھیوں سے جمیل کی طرف دیکھا۔ "بھائی جان نے اب، اتنی دیر بعد، جواب دیا۔ اگر یہ پہلے ہی بتلا دیتے تو کیا ہو جاتا؟--- بھلا پنکھے سے بجلی کیسے بنتی ہو گی؟ پہلے تو بجلی سے پنکھا چلتا تھا، اور اب پنکھے سے بجلی بنے گی۔ اللہ میاں نے بھی کیا کیا چیزیں بنائی ہیں۔ اُس کا کارخانہ بہت بڑا ہے۔" اسے ابّا کی بات یاد آ گئی۔

ایک شان دار عمارت کی پیشانی پر بڑی سی رنگین تصویر جُھومر کی طرح آویزاں تھی۔ تصویر کے نیچے انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ "شاید یہ سِنیما ہال ہے،" زہرا نے سوچا۔ عمارت کے باہر ایک طرف مرد قطار میں کھڑے تھے، دوسری طرف عورتیں۔ جب رکشا اس عمارت کے قریب سے گزرا تو اس نے اس بڑی سی رنگین تصویر کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ تصویر واضح بھی نہیں ہو سکی تھی کہ اس نے منھ پھیر لیا۔ سیاہ نقاب کے پیچھے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس سے پہلے اس نے صرف ایک بار ایسی تصویر دیکھی تھی۔ وہ جمیل کا بستر تِہا رہی تھی؛ جیسے ہی اس نے تکیہ اٹھایا، ایک تصویر زمین پر گر گئی۔ تصویر دیکھ کر اس کا دل کتنے زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے تصویر تکیے کے نیچے رکھ دی تھی اور نہایت عجلت میں بستر تِہا کر الٹےپیروں کمرے سے نکل بھاگی تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ کئی دنوں تک جمیل سے نظریں چُراتی رہی جیسے وہ

تصویر جمیل کے نہیں خود اس کے تکیے سے برآمد ہوئی ہو۔

"یہ اتنا بڑا سا فوٹو چوراہے پر کس لیے لگایا گیا ہو گا؟" اس نے سوچا۔ "جب چوراہے پر ایسا فوٹو لگا ہے تو سنیماہال کے اندر جو فلم دکھلائی جاتی ہو گی وہ کیسی ہوتی ہو گی؟ کون دیکھتا ہو گا یہ سب؟" اس نے کنکھیوں سے جمیل کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ جمیل اس وقت کسی اور طرف دیکھ رہے تھے۔ "اگر رکشا اتنی تیزی سے آگے نہ بڑھ جاتا تب بھی اس فوٹو کو نہ دیکھتی۔ بھلا مَیں کیوں دیکھنے لگی ایسے بےہودہ فوٹوؤں کو۔"

جب عذرا دوسری بار سسرال سے لوٹی تھی تو اس نے زہرا سے بتایا تھا کہ ایک ایسی فلم بھی ہوتی ہے جس میں کچھ نہیں چُھپایا جاتا، سب کچھ دِکھلا دیا جاتا ہے۔

"کیا تم نے وہ فلم دیکھی ہے؟" زہرا نے عذرا سے پوچھا تھا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ کئی بار دیکھی ہے،" عذرا نے اتنی آسانی کے ساتھ بتا دیا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، جیسے کہہ رہی ہو، "ہاں، میں آئینہ دیکھتی ہوں۔"

پھر عذرا فلم کی تفصیلات بتانے لگی۔ مگر زہرا تاب نہ لا سکی، عذرا سے ہاتھ چھڑا کے، منھ چھپاتی اور لپکتی جھپکتی، کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور بدن کا ایک ایک عضو جیسے اسے شرمسار کر دینے کے لیے بےچین ہو گیا تھا۔

زہرا کو عذرا کی باتیں سچ نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ وہ سوچتی، عذرا اپنی باتوں کو لچّھےدار بنانے کے لیے ایسی باتیں بھی کر جاتی ہے جو شاید کسی کے گمان میں بھی نہ ہوں۔ زہرا کا شعور ان باتوں کو قبول تو نہ کرتا مگر اس کے لاشعور میں ایک نامعلوم سی کسک باقی رہ جاتی جو آہستہ آہستہ بےچینی یا خواہش کی صورت اختیار کر لیتی۔

کلیجے میں اُبال سا اٹھا۔ اس نے نقاب منھ میں ٹھونس کر سانس روک لیا۔ جمیل کے پاس بیٹھ کر اور اتنی بھیڑ سے گزرتے ہوے کھانسنا اسے اچھا نہیں لگا۔ مگر وہ سانس کب تک روکے رہتی -- یہ اس کے اختیار میں کہاں تھا -- کھانسی آ ہی گئی۔ حلق سے کلیجے تک زہر سا پھیل گیا۔ صبح فجر کی نماز کے لیے جب اس نے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا تھا تو کھانسی کا ایک طویل دورہ پڑا تھا۔ پھر دیر تک کھانسنے کے بعد اس نے تھوکا تو چڑیا کی کلیجی جیسی پُھٹک زمین میں چمٹ گئی تھی۔ اس نے پُھٹک کو مٹّی کی تہہ

میں چھپا دیا تھا اور بستر پر پڑ کر دیر تک ہانپتی رہی تھی۔ امّاں نے سلام پھیر کر آواز دی تو وہ جلدی سے اٹھ گئی تھی تاکہ امّاں اس کی کیفیت بھانپ نہ لیں۔

امّاں نے کتنی جلدی روانہ کر دیا تھا۔ "صبح صبح چلی جاؤ، ورنہ چہل پہل شروع ہو جائے گی اور جو بھی ملے گا وہ یہی پوچھے گا، بہن کو کہاں لیے جا رہے ہو؟" جیسے بہن نہ ہوئی چکوے کی بکری ہو گئی۔

بعد میں وہ کسی چیز کو غور سے دیکھ ہی نہ سکی۔ کھانسی کے دوران اس نے جن چیزوں کی جھلکیاں دیکھیں وہ دھندلی اور تھرتھراتی ہوئی معلوم ہوئیں۔

"خیر، اگر واپسی پر شام نہ ہو گئی تو انھیں دوبارہ دیکھ لیں گے،" اس نے سوچا۔

رکشا ایک موڑ پر رک گیا۔ یہ ایک صاف ستھرا علاقہ تھا۔ یہاں خاموشی تھی، مگر گاؤں کی سی خاموشی نہیں بلکہ ایک باوقار خاموشی۔ کشادہ بنگلے، پورٹیکو میں کھڑی ہوئی قیمتی گاڑیاں، سرخ پھولوں کی قبا پہنے ہوئے گل مُہر کے درخت -- جیسے یہ سب اِسی خاموشی کے اہتمام کے لیے تھا۔ ذرا دور پر ایک اونچی سی عمارت تھی -- انتہائی اونچی عمارت۔ اس نے سر اٹھا کر اس بلندوبالا عمارت کو اس کی انتہا تک دیکھنے کی کوشش کی۔ "اُف، اتنی اونچی!" اس نے خوش گوار حیرت کے ساتھ سوچا۔ "اس کی آخری منزل پر جا کر کتنی دور تک دیکھا جا سکتا ہو گا،" مگر اسے تعجّب ہوا، "اس پر لوگ کس طرح چڑھتے ہوں گے؟ کیا انھیں ڈر بھی نہیں لگتا ہو گا؟ بارشیں ہوتی ہیں، اتنی تیز تیز آندھیاں آتی ہیں، اور یہ گرتی نہیں؟" پھر ذرا توقف کے بعد اس نے سوچا، "کب تک کھڑی رہے گی؟ ایک نہ ایک دن تو گر ہی جائے گی۔"

جمیل نے رکشاوالے کو پیسے دیے۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "اب اترو گی یا رکشے پر ہی بیٹھی رہو گی؟"

وہ دھم سے کود پڑی۔ برقع پیروں میں الجھ گیا۔ رکشے کا ہُڈ نہ پکڑ لیتی تو منہ کے بل گر جاتی۔ جمیل ترچھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کلینک میں داخل ہو گئے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر احتیاط کے ساتھ قدم رکھتی ہوئی وہ بھی کلینک میں داخل ہوئی۔

"یہاں بیٹھ جاؤ،" جمیل نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ

سعادت مندی کے ساتھ جلدی سے بیٹھ گئی، کہ رکشے پر جو غلطی ہوئی تھی اس کی تلافی ہو جائے۔ جمیل نے اندر جا کر کمپاؤنڈر سے کوئی بات کی، پھر اس سے یہ کہہ کر باہر چلے گئے کہ ابھی آتا ہوں۔ اس نے لمبا سا سانس لیا اور کرسی کی ٹیک لگا لی۔ کلینک میں زیادہ تر عورتیں، لڑکیاں اور بچّے بیٹھے تھے۔ ان میں بعض کی سمٹی ہوئی جسامت، مدقوق چہرے اور حلقوں سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی، بےآب آنکھیں بیماری کا پتا دے رہی تھیں، لیکن بعض کی بیماری ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ ایک تندرست عورت، جو شاید کسی مریض کو لے کر آئی تھی، منہ پر رومال رکھے اس طرح بیٹھی تھی جیسے ذرا سی بےاحتیاطی سے بیماری اس کے منہ میں داخل ہو جائے گی۔ کنارے کی کرسیوں پر بیٹھے ہوے مرد اخبار پڑھ رہے تھے۔ دو تین برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ "عورتیں ایک جگہ قرار کے ساتھ بیٹھی رہتی ہیں مگر مردلوگ نہیں بیٹھ پاتے--- کس قدر گرمی ہے!" اس نے سوچا۔ پیشانی اور کنپٹیوں پر پسینا جمع ہو کر چیونٹیوں کی طرح رینگتا ہوا گردن کی طرف آتا اور گردن میں لپٹے ہوے دوپٹے میں جذب ہو جاتا۔ اس نے نقاب سے پسینا پونچھا تو اس کا جی بُرا ہو گیا۔

"نقاب میں کیسی بُو آ رہی ہے۔ برقع بہت دنوں سے دُھلا بھی تو نہیں۔ آخر کوئی کہاں تلک دھوئے، کیا کیا کرے۔ ویسے ہی روزانہ اتنا کام دھندا ہوتا ہے کہ آندھی روگ آ جاتا ہے۔ امّاں بےچاری میرا کتنا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ جب سے بیماری ظاہر ہوئی ہے، کوئی ایسا کام نہیں کرنے دیتیں جس سے تکلیف بڑھ جائے۔ وزن تو اٹھانے ہی نہیں دیتیں۔ میں نے سِل اٹھائی نہیں کہ وہ آنکھیں پھاڑ کے چیخیں: آخر تم چاہتی کیا ہو؟ بیماری اور اتنی بڑی سِل؟ جاڑوں‌بھر امّاں نے مجھے برتن نہیں دھونے دیے۔ اسی لیے تو ہاتھوں کی جِلد پہلے سے کچھ اچھی ہو گئی ہے، مگر ان کی سختی اور پیلاہٹ روز بہ روز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔"

اس نے ہاتھ نقاب کے اندر کر کے غور کیا۔ چھپکلی کے پیٹ کی سی پیلی پیلی انگلیاں اسے اچھی نہیں لگیں۔

"جب عذرا کی شادی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی تو اس کے گدرائے ہوے ہاتھوں کی انگلیاں کتنی اچھی لگ رہی تھیں۔ جو بھی لڑکی آتی، اس کے ہاتھ ضرور دیکھتی۔ اب اس نے ناخن بڑھا لیے ہیں اور ان میں طرح طرح کی نیل پالش لگائے رہتی ہے۔ میں ناخن بڑھا لوں تو میرے

گھر میں کوئی میرے ہاتھ کا پانی بھی نہ پیے۔ ناخن تو خیر بڑھانا بھی نہیں چاہیے؛ کھایاپیا سب مکروہ۔ عذرا تو آٹا تک گوندھتی ہے اور سب لوگ اس کی پکائی ہوئی روٹی کھاتے ہیں۔ اس کی تو خیر بات ہی دوسری ہے۔ وہ تو پتا نہیں کیا کیا کرتی ہے۔ شادی سے پہلے بھی وہ کتنی آزادی کے ساتھ رہتی تھی۔ جو جی چاہتا پہنتی اوڑھتی، جس کے گھر جانے کو جی چاہتا چلی جاتی، اُن باتوں پر ہنستی رہتی جن پر نہیں ہنسنا چاہیے -- مگر اس کے گھر میں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ عادل سے اُس کی کتنی لڑائیاں ہوتی تھیں مگر وہ ہار نہیں مانتی تھی، اپنی بات منوا کے ہی چھوڑتی۔ شادی کے بعد ذرا بدل گئی ہے، مگر اب بھی گھر آتی ہے تو کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے۔"

اور ایک اس کا گھر تھا، کہ جیسے گھر نہ ہوا مدرسہ ہو گیا۔ ذرا سی لغزش ہوئی نہیں کہ ڈانٹ پڑی۔ کسی طرف سے امّاں کی آواز آتی: "زہرا، دوپٹّا ٹھیک کرو۔" کبھی ابّا پیار بھرے لہجے میں کہتے: "بیٹی، اتنے زور زور سے نہ بولا کرو۔ آواز کا پردہ بھی لازم ہے۔" کبھی جمیل جھنجھلاتے: "بےوقوف، تجھے سمجھ کب آئے گی؟" خفگی کسی سے ہے اور غصّہ اس پر اتر رہا ہے۔ زہرا کیا تھی بیمار بلّی تھی کہ جس کے پاس سے گزری وہ دُردُر پھٹ پھٹ کرنے لگا۔ ابّا تو خیر اپنی مصروفیتوں اور ذمّےداریوں میں اکثر اسے بھول جاتے، مگر جمیل تو جیسے اس کی پاسبانی کے لیے پیدا ہوے تھے۔ "یہاں کیوں کھڑی ہو؟ --- اتنی تیز تیز کیوں چلتی ہو؟ --- دروازے پر قدم نہ رکھ دینا، بےوقوف!"

جب سے جمیل کو ملازمت مل گئی تھی، وہ صبح شہر چلے جاتے اور رات گئے لوٹتے۔ اس درمیان اسے ایک اطمینان کا سا احساس رہتا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد عدیل پَرپُرزے نکالنے لگا۔ وہی جمیل کی سی خاصیتیں اُس میں بھی پیدا ہوتی جا رہی تھیں۔ حالاں‌کہ عدیل زہرا سے دو برس چھوٹا تھا، لیکن وہ اس پر حاوی رہتا۔ عدیل کی بےجا باتوں پر وہ اکثر اس سے الجھ بیٹھتی مگر پیش نہ پاتی۔ ابّا تو خیر اس کی حمایت کرتے مگر امّاں عدیل کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔ "ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ لڑکی ذات کو سختی میں نہ رکھا جائے تو بےباجنو ناچے گی۔ شکیلہ کو دیکھو؛ زیادہ ڈھیل کا کیا نتیجہ نکلا۔ گھر والے آنکھوں پر پٹّیاں باندھ کر بیٹھ سکتے ہیں مگر سسرال والوں کو کیا پڑی تھی جو وہ جابےجا برداشت کرتے۔ اور سچ پوچھو تو کوئی جان بوجھ کر مکھی نہیں نگلتا۔ اب مائیکے میں ایک بچّے کے ساتھ پڑی سڑ رہی

ہیں۔"

"اور ثریّا باجی؟" وہ سوچتی۔ "ثریّا باجی کے ماں باپ نے تو انہیں بڑی سختیوں میں رکھا تھا۔ وہ تو کبھی بےباجنو نہیں ناچیں۔ سسرال میں سب کی خوب خدمتیں کیں، ہُوں سے ٹُوں نہیں کی۔ پھر؟ ثریّا باجی سکے میں پڑی کیوں سڑ رہی ہیں؟"

پہلے ثریّا باجی کتنی اچھی لگتی تھیں، جیسے اللہ میاں نے انہیں اپنے ہاتھ سے بنایا ہو۔ جب ہنستی تھیں تو لگتا تھا جیسے اجالا سا ہو گیا ہو۔ اور اب، ہنستی ہیں تو لگتا ہے جیسے رو رہی ہوں۔

"بےچاری ثریّا باجی،" اسے خیال آیا۔ "اور ہاں، یہاں مکھیاں تو دکھلائی ہی نہیں دے رہی ہیں۔ اچھا ہی ہے جو نہیں ہیں۔ کمبخت ماری ہوتیں تو بیٹھنا دوبھر کر دیتیں۔ شہروں میں ہوتی بھی کم ہیں۔ پتا نہیں کیوں۔ یہاں گندگی جو نہیں ہوتی۔ مچھر بھی نہیں ہوتے ہوں گے۔ یا ہوتے ہی ہوں گے، یہاں رہنے والے ہی جانیں۔ یہ لیو!" اسے ہنسی آ گئی۔ ایک مکھی فرش پر بیٹھی ہاتھ مَل رہی تھی۔

ایک آدمی ذرا ذرا دیر بعد اخبار کے صفحات پلٹتا اور کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اسے بڑی نفرت کا احساس ہوتا۔ "اب اس کی طرف دیکھوں گی ہی نہیں،" اس نے سوچا اور برآمدے سے باہر دیکھنے لگی۔

"جب کوئی مرد اس طرح گھُور کے دیکھتا ہے تو جی چاہتا ہے کمبخت کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ پتا نہیں بھائی جان کہاں گئے۔ یہاں اتنی گرمی میں بیٹھ کر کرتے بھی کیا۔ کسی پیڑ کے نیچے کھڑے سگریٹ پی رہے ہوں گے۔ اب وہ سگریٹ بہت پینے لگے ہیں۔ بہت دن پہلے جب بھائی جان چھپ چھپ کر سگریٹ پیتے تھے اور میں ان کے کمرے میں جاتی تھی تو وہاں عجیب سی بساند آتی رہتی تھی۔ اور پھر ایک دن ان کا بستر تہاتے وقت ان کے تکیے کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبیا ملی تھی۔ میں نے اسے سونگھا تھا تو کیسا جی مَتلانے لگا تھا۔ اُس دن میں سمجھ گئی تھی کہ ان کے کمرے میں بساند سی کیوں بسی رہتی ہے۔ عذرا مجھ سے بھائی جان کے بارے میں پوچھا کرتی تھی۔ کمرے میں کیا کرتے رہتے ہیں؟ سگریٹ پیتے ہیں کہ نہیں؟ ان کی کتابوں میں تم کو کبھی کسی لڑکی کا فوٹو تو نہیں ملا؟ شروع میں اسے سب کچھ بتلا دیا کرتی تھی، مگر بعد میں، جب امّاں نے سختی سے منع کر دیا کہ گھر کی کوئی بات عذرا سے مت بتلایا کرو، تو میں اس کے سوالوں پر یا تو چڑ

جاتی یا غلط سلط جواب دے دیا کرتی۔ مگر عذرا کو جانے کیسے وہ سب باتیں خود بہ خود معلوم ہو جاتی تھیں جو مجھے بھی معلوم نہیں ہو پاتی تھیں۔ بہت دنوں تلک تو مجھے یہی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ بھائی جان کے بارے میں کیوں پوچھا کرتی ہے، مگر دھیرے دھیرے ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں۔ پھر بھائی جان بھی بدلنے لگے۔ پہلے عذرا گھر آتی تھی تو انھیں جیسے خبر ہی نہیں ہوتی تھی، اپنے کام میں لگے رہتے تھے؛ مگر بعد میں یہ ہوا کہ اِدھر عذرا گھر میں آئی نہیں کہ بھائی جان کو پیاس لگنے لگی۔ وہ اپنے کمرے سے نکلتے، گھڑونچی کے پاس جا کر کٹورے میں پانی انڈیلتے۔ پانی کٹورے سے چھلک کر زمین پر ضرور گرتا اور گھڑے سے ایسی آواز پیدا ہوتی جیسے ٹوٹ گیا ہو۔ امّاں باورچی خانے میں جل بُھن رہی ہوتیں؛ وہیں سے چیختیں: گھر میں ایک کورا گھڑا بچا ہے، اسے بھی ناپید کر دو۔ بھائی جان کو تو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دیتا۔ وہ کٹورا منھ میں لگاتے اور پلکوں کو خوب اوپر تلک اٹھا کر عذرا کی طرف دیکھتے۔ اس وقت وہ ذرا سا پانی پیتے، اور چھلکاتے زیادہ۔ پھر بچا ہوا پانی زمین پر چھپاک سے پھینک کر، کٹورے کو گھڑے پر اوندھا کر خوب گہرا سانس لیتے جیسے زیادہ پانی پی گئے ہوں۔ پھر بھائی جان کمرے میں جاتے وقت عذرا کو خوب غور سے دیکھتے۔ عذرا بھی خاموش ہو کر انھیں دیکھنے لگتی۔ میں انجان بن کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ پھر امّاں کی آواز آتی: کہاں مر گئیں زہرا! میں دوڑتی ہوئی امّاں کے پاس جاتی۔ امّاں مجھے دیکھتیں اور کہتیں: اب تم کو دنیاجہان کی کچھ خبر ہے کہ نہیں؟ میں جلدی جلدی کوئی کام کرنے لگتی۔ پھر امّاں دبی زبان سے پوچھتیں: عذرا کیا پوچھ رہی تھی؟ کچھ بھی نہیں، میں جواب دیتی۔ پھر وہی کچھ بھی نہیں، وہ دانت پیس کے حلق سے آواز نکالتیں، اتنی دیر سے منھ جوڑے خاموش بیٹھی تھیں؟ پھر ہمیشہ کی طرح کہتیں: خبردار جو اس سے کوئی بات بتلائی؛ جلتے چِمٹے سے زبان کھینچ لوں گی۔

"امّاں بھی خوب ہیں! بھلا میرے گھر میں ایسے کون سے خزانے چھپے ہوے ہیں جن کے بارے میں عذرا سے بتلا دیتی اور ایسے کون سے راز تھے جن کے کھل جانے سے طوفان آ جاتا۔ ہاں، اب جو میرے سینے میں ایک راز پَل رہا ہے وہ تو کسی سے بتلائے بغیر بھی ایک نہ ایک دن کھل ہی جائے گا۔"

کچھ دیر کے بعد جمیل واپس آ گئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے جیسے وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہوں۔ پشت پر ہاتھ باندھے وہ کچھ دیر

ٹہلتے رہے۔ پھر زہرا سے ذرا اک فاصلے پر بیٹھ گئے۔ "بھائی جان میرے برابر والی کرسی پر بھی تو بیٹھ سکتے تھے،" اس نے سوچا۔ "عذرا کی شادی کے بعد بھائی جان زیادہ بُجھے بُجھے رہنے لگے ہیں۔"

اب کلینک میں چند مریض رہ گئے تھے۔ زہرا کو جس کی شکل سے نفرت ہو گئی تھی وہ آدمی جا چکا تھا۔ اور وہ عورت بھی جا چکی تھی جس کی قمیص کے دامن پہ ریشم کی کڑھائی کا خوب صورت ڈزائن بنا ہوا تھا۔ زہرا نے اس ڈزائن کو مختلف زاویوں سے دیکھا تھا مگر فاصلے کی وجہ سے وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ ڈزائن مشین سے بنایا گیا تھا یا ہاتھ سے۔

"خیر،" اس نے سوچا، "گھر جا کے ویسا ہی ڈزائن بناؤں گی ضرور۔"

ایک طویل جماہی سے اس کی کنپٹیاں چٹخ سی گئیں اور درد کی لہر جبڑوں کو چیرتی پھاڑتی گزر گئی۔

"توبہ ہے! یہاں بیٹھے بیٹھے تو جیسے زندگی گزر جائے گی۔ کیسا جی گھبرا رہا ہے۔ صبح سے کچھ کھایاپیا بھی تو نہیں۔ ایک پیالی چائے کے ساتھ آدھی چپاتی کھا کے چل پڑی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ بھائی جان کوئی چیز لے آئیں اور کہیں: تم کو بھوک لگ رہی ہو گی، لیو کھاؤ! بھائی جان کو بھی تو بھوک لگ رہی ہو گی۔"

باہر ہوا چل رہی تھی۔ اونچے اور گھنے درختوں کی شاخیں اس طرح جھوم رہی تھیں جیسے انھیں خوب زور کی ہنسی آ رہی ہو۔

"یہ گل مُہر کے پیڑ ہیں،" اس نے سوچا، "کتنے ڈھیر سارے پھول لگے ہیں ان میں۔ اور ایک پیڑ ہمارے گھر میں لگا ہوا ہے، گولھڑ کا پیڑ۔ کمبخت میں پھول ہیں نہ پتّیاں۔ لُنڈمُنڈ۔ دن رات سڑے ہوے گولھڑ ٹپکتے رہتے ہیں۔ کوّے اور مینائیں بَکتی رہتی ہیں۔ محلّے کے لڑکوں کو بھی کہیں ٹھکانا نہیں ملتا۔ جب نظر اٹھاؤ دیواروں پر اُچکتے پھاندتے دکھلائی دیتے ہیں۔ جب تیز تیز ہوائیں چلتی ہیں تو کچّے گولھڑ آ آ کے کیسے بدن پر لگتے ہیں، جیسے کسی نے چٹکی لے لی ہو۔ ابّا کے جب گولھڑ لگتا ہے تو وہ بِلبِلا جاتے ہیں اور سر اوپر اٹھا کے کہتے ہیں: جی بھر کے کر لو حرامی پن! بہت جلد تمھارا نام و نشان مٹا دوں گا۔ ابّا کی اس بات پر سب کیسے منھ چھپا چھپا کے ہنستے ہیں۔"

اس نے نقاب سے پیشانی کا پسینا پونچھا اور چہرے پر لٹکتی ہوئی بالوں کی لٹ اوپر کرتے ہوے سوچا، "میرے بال کتنے سخت اور خشک ہو

گئے ہیں۔ سردیوں میں امّاں نہانے نہیں دیتی تھیں۔ اب گرمیاں آ گئی ہیں۔ روز نہایا کروں گی۔ کس قدر حبس ہے۔"

اس کا جی چاہا برقع اتار کے کنارے رکھ دے اور پنکھے کے نیچے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر خوب لمبے لمبے سانس لے کہ پھیپھڑے ہوا سے بھر جائیں۔

"کبھی کبھی اس برقعے سے کس قدر الجھن ہونے لگتی ہے، جیسے کوئی سزا بُھگت رہے ہوں۔ جب عذرا کی شادی ہو گئی تو اس نے برقع اتار کے سات تہوں میں رکھ دیا، اور اب ایسے دندناتی پھرتی ہے جیسے کبھی برقع اوڑھا ہی نہ ہو؛ اس گلی سے اُس گلی، اُس گلی سے اِس گلی۔ کوئی اس کو ٹوکتا بھی نہیں۔ ٹوکے تو اپنی بہوبیٹیوں کے شجرے نکلوائے۔ کوئی مجھ سے کہے، برقع اتار دو، تو میں کبھی نہ اتاروں۔ بدن کے اُبھاروں کو سب کے سامنے اُچھالتی پھروں؟ توبہ ہے، مجھے تو سوچ کر ہی شرم آتی ہے۔"

اب کے کمپاؤنڈر نے نام پکارا تو زہرا کے سامنے بیٹھا ہوا ایک نوجوان چونک کر کمپاؤنڈر کی طرف دیکھنے لگا۔ دوسرا آدمی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ نوجوان کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر دوبارہ اونگھنے لگا۔ اب وہاں جمیل اور زہرا کے علاوہ یہی مدقوق نوجوان رہ گیا تھا جو انتظار کی شدّت سے مزید سوکھتا جا رہا تھا۔

"اگر بھائی جان قریب نہ بیٹھے ہوتے تو ذرا دیر کے لیے نقاب اوپر کر لیتے۔ کچھ تو منہ میں ہوا لگتی۔ ایسے سوکھے سڑے مردوں کے سامنے نقاب پلٹ دینے میں کیا ہرج۔"

ایک بار ماموں نے کہا تھا، "اب برقعے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔ بھئی میں نے تو اپنی کسی بیٹی کو برقع نہیں اڑھایا، اور اب کون اڑھاتا ہے؟ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ لڑکیاں نوکریاں کر رہی ہیں، پولیس اور فوج میں بھرتی ہو رہی ہیں، اور ایک آپ لوگ ہیں کہ اپنی بیٹیوں کو برقعوں میں لپیٹے بیٹھے ہیں۔"

"اجی ہاں! نوکریاں کر رہی ہیں، پولیس اور فوج میں بھرتی ہو رہی ہیں۔ اور کیا کیا کر رہی ہیں، کچھ یہ بھی خبر ہے آپ کو؟" ابّا نے چڑ کر کہا۔

"آپ لوگ تو ہمیشہ بُرے پہلو پر ہی نظر رکھتے ہیں،" ماموں نے کہا۔

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ ہم لوگ جو بہتر سمجھتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ آپ اپنی بیٹیوں کا برقع اتاریے چاہے ننگا نچائیے! میری بیٹی جس طرح رہ رہی ہے اسی طرح رہے گی۔" ابا نے خوب غصّے سے ماموں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں اپنی بیٹیوں کو ننگا نچاتا ہوں؟" ماموں کی آواز گلے میں پھنس گئی۔

"اور نہیں تو کیا؟" بھائی جان کو بھی غصّہ آ گیا۔ "آپ کون ہوتے ہیں ہمارے معاملات میں دخل دینے والے؟"

"جمیل، تم خاموش رہو۔" امّاں نے منہ پر انگلی رکھ کے آہستہ سے کہا۔

"کیوں خاموش رہوں؟" بھائی جان نے زور سے کہا تو امّاں خاموش ہو گئیں۔ وہ کبھی بھائی جان سے زبان نہیں لڑاتیں، کہ جوان لڑکوں سے زبان لڑانا اپنی عزّت خاک میں ملانا ہے۔

"ماموں خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ وہ دن اور آج کا دن، انھوں نے ہمارے گھر میں قدم نہیں رکھا۔اب کی عید میں بھی نہیں آئے۔ امّاں نے جا کے معافی تلک مانگی، مگر وہ یہی کہتے رہے؛ اپنی بیٹیوں کو ننگا نچانے والے شریف گھرانوں میں نہیں جایا کرتے۔ جب ماموں گھر آتے تھے تو کتنا اچھا لگتا تھا۔"

کمپاؤنڈر نے زہرا کا نام پکارا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور بدن تھرتھرانے لگا، جیسے اکثر نیند میں چونک کر تھرتھرانے لگتا تھا اور دل کی دھڑکن تیز ہو جایا کرتی تھی۔ پسیجے ہوئے پیروں میں سینڈل جماتی ہوئی وہ جمیل کے ہمراہ ڈاکٹر کے چیمبر میں گئی۔

"بھائی جان بیٹھ جائیں تو میں بھی بیٹھوں،" اس نے سوچا۔

"بیٹھیے،" ڈاکٹر نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انتہائی نرمی کے ساتھ کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر کے قریب ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکی کے نقش و نگار ڈاکٹر کے نقش و نگار سے مشابہ تھے۔ دونوں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نقاب اوپر کر لو،" جمیل نے کہا۔ اس نے نقاب ہٹا دی۔

"جی؟" ڈاکٹر جمیل سے مخاطب ہوا۔

جمیل نے اس کی بیماری سے متعلّق کچھ باتیں اپنے طور پر بتائیں، لیکن بعض باتیں ایسی تھیں جو وہ نہیں جانتے تھے، مثلاً سینے میں کس طرح کا درد ہوتا ہے، رات کو نیند کس وقت آتی ہے، آتی بھی ہے یا نہیں، صبح سے شام تک خون کی کتنی پُھٹکیاں نالی میں بہہ جاتی ہیں، کھانے کا مزہ کیسا ہوتا ہے--- اور بہت سی باتیں جو دوسرا نہیں بتا سکتا تھا سوائے اس کے

جو خود اس کیفیت میں مبتلا ہو۔

"اب یہی دیکھو،" اس نے سوچا، "بھائی جان بتلا رہے ہیں کہ بیماری کا سلسلہ ایک سال پہلے شروع ہوا تھا، جبکہ بیماری کو ڈیڑھ سال ہو گیا۔"

"آپ بتائیے،" ڈاکٹر نے زہرا سے کہا۔

"اب میں بھائی جان کے سامنے کیسے بتلاؤں؟" وہ الجھن میں پڑ گئی۔

"ہاں ہاں، کہیے،" ڈاکٹر نے تسلّی دی۔

وہ خود کو سنبھال سنبھال کر، اکھڑے لہجے میں حال بتانے لگی۔ بعض کیفیات ایسی تھیں جن کے اظہار سے وہ خود قاصر تھی۔

حال سننے کے بعد ڈاکٹر اس کے پاس آ کر معائنہ کرنے لگا۔ معاون لڑکی بھی اس کے قریب آ گئی۔ معائنے کے دوران معاون لڑکی کے استفسار پر ڈاکٹر اسے انگریزی میں جواب دیتا رہا۔

"آپ کے گھر میں کسی کو ٹی بی ہے؟" ڈاکٹر نے جمیل سے پوچھا۔

"جی نہیں،" جمیل نے جواب دیا۔

"خاندان میں کسی اور کو؟"

"نہیں، کسی کو بھی نہیں۔" جمیل نے جواب دیا۔

"بھائی جان کو یاد ہی نہیں،" زہرا نے سوچا، "دادی کو شاید ٹی بی ہی تو تھی، جبھی تو دن رات کھانستی رہتی تھیں اور سوکھ کے کانٹا ہو گئی تھیں۔"

"اس سے پہلے کسی کو کنسلٹ کیا تھا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں،" جمیل نے بتایا، "قصبے کے ایک سرکاری اسپتال میں کچھ دن علاج کیا تھا۔"

ڈاکٹر نے معاون لڑکی کی طرف دیکھا، پھر دونوں کے چہروں پر تمسخرآمیز مسکراہٹ بیدار ہوئی۔

"جب کیس بگڑ جاتا ہے تو آپ لوگ پیشنٹ کو لے کر شہر کی طرف بھاگتے ہیں،" ڈاکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔ "فی الحال کچھ دوائیں لکھ رہا ہوں۔ یہ کھلائیے۔ ایکسرے اور بلڈ رپورٹ لے کر ایک ہفتے کے بعد آئیے گا۔ ان کو لانے کی ضرورت نہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب، یہ پرہیز نہیں کرتی۔" جمیل نے کہا۔

ڈاکٹر نے چشمے کے اوپر سے جھانک کر زہرا کی طرف دیکھا۔ "کیوں بی بی، آپ پرہیز نہیں کرتیں؟"

وہ شرما گئی۔

"ٹھیک ہے، پرہیز نہیں کرتیں تو نہ کیجیے، مگر دوا ضرور کھائیے۔ دوا تو کھا لیں گی؟"

"جی۔" اس نے سر کو جنبش دی۔

"پرہیز بھی کر لیجیے تو جلدی ٹھیک ہو جائیے گا۔" ڈاکٹر انتہائی نرمی کے ساتھ پرہیز سے متعلّق ہدایات دینے لگا۔

ڈاکٹر کا اس انداز سے باتیں کرنا اور ہدایات دینا اسے اچھا لگا، جیسے وہ باتیں نہ کر رہا ہو بلکہ لوری دے رہا ہو۔

"یہ بالکل ماموں جان کی طرح باتیں کرتے ہیں۔" اسے ماموں جان یاد آ گئے۔

کلینک سے باہر نکلنے کے بعد جمیل ٹھٹھک کر رک گئے۔ "تم باہر چلو، میں آتا ہوں۔" انھوں نے زہرا سے کہا اور اندر چلے گئے۔ وہ باہر آ کر گل مُہر کے پھول دیکھنے لگی۔ سرخ پھولوں سے لدی ہوئی گل مُہر کی شاخیں تیز ہوا سے اسی طرح جھوم رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد جمیل باہر آ گئے۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ جمیل کا چہرہ تردد سے بوجھل تھا۔

"بھائی جان مجھے یہاں چھوڑ کے ڈاکٹر کے پاس کیوں گئے تھے؟" اس نے سوچا۔ "شاید کچھ پوچھنے گئے ہوں گے۔ ڈاکٹر نے پتا نہیں ان سے کیا بتلایا ہو گا۔"

کلینک سے لیبارٹری جاتے وقت وہ ایک تشویش میں مبتلا رہی۔ بس یہی خیال کہ ڈاکٹر نے پتا نہیں بھائی جان سے کیا بتلایا ہو گا۔ آخر کچھ دیر بعد اس نے پوچھ ہی لیا، "ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں،" جمیل نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "کہے گا کیا۔ ایکسرے اور خون کی رپورٹ دیکھنے کے بعد ہی کچھ بتا سکے گا۔ اب ایک ہفتے کے بعد پھر آنا پڑے گا۔" جمیل نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

جب کمپاؤنڈر نے اس کی انگلی میں پن چبھوئی تو تشویش کا احساس تکلیف کی تہہ میں اتر گیا۔ اس نے انگلی پر نظر ڈالی۔ کمپاؤنڈر اس کی انگلی سے اس طرح خون نچوڑنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے بھوکی بکری کے تھن سے دودھ دوہ رہا ہو۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ جمیل سہارا نہ دیتے تو وہ چکرا کے گر جاتی۔ خون دینے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ جمیل نے اس

کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسپرٹ لگائی۔ جمیل کے ہاتھوں کے نامعلوم سے لمس نے اس کے بدن میں جُھرجُھری سی پیدا کر دی۔

"میں لگا لوں گی۔" اس نے کہا۔ جمیل نے اسے پھریری دے دی۔ وہ آہستہ آہستہ انگلی پر اسپرٹ لگانے لگی۔

کمپاؤنڈر دوبارہ اس کے پاس آیا۔ "اندر آئیے۔" اس نے کہا۔ وہ جمیل کے ہمراہ دوسرے کمرے میں گئی۔

"یہ ہٹا دیجیے۔" کمپاؤنڈر نے برقعے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے کمپاؤنڈر کی طرف دیکھا۔

"برقع اتار کے مجھے دے دو۔ ایکسرے ہو گا۔" جمیل نے کہا۔

اس نے بدحواسی کے ساتھ برقع اتار کے جمیل کی طرف بڑھا دیا۔

"دوپٹا بھی دے دو۔"

اس نے پسینے سے بھیگا ہوا دوپٹا گردن سے کھول کر جمیل کو دے دیا۔ جس وقت وہ ایکسرے مشین کے سامنے بےدست و پا کھڑی تھی، جمیل دیوار پر آویزاں کیلنڈر دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پشت کی طرف تھے۔ دوپٹے کا ایک سرا ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر پنکھے کی ہوا سے فرش پر اس طرح تھرتھرا رہا تھا جیسے نزع کی کیفیت میں مبتلا ہو۔

ایکسرے مشین آپریٹر نے ایک بےنیازی کے ساتھ اس کے ہاتھ برابر کرتے ہوے کہا، "بس اسی طرح کھڑی رہیے گا۔"

اس نے نظریں جھکا لیں اور اس طرح ساکت ہو گئی جیسے بےروح بدن تابوت میں رکھ دیا گیا ہو۔

"امّاں بیماری سے زیادہ اِن باتوں سے گھبراتی ہیں، اسی لیے تو معمولی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ نانی تو اتنا گھبراتی تھیں کہ کبھی اسپتال ہی نہیں گئیں۔ بڑھاپے میں ان کو کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ تخت پر بیٹھ رہی تھیں، ٹانگ میں کِیل لگ گئی۔ پوری ٹانگ سڑتی چلی گئی۔ سب نے لاکھ کہا کسی ڈاکٹر کو دکھلا دو۔ مگر نہیں مانیں، الٹے مشورہ دینے والوں کا منہ نوچ لیتیں۔ تم لوگ مجھے بےغیرتی کا جامہ پہنانا چاہتے ہو؟ غیر مردوں کو ٹانگیں دکھلاؤں؟ نہ بابا نہ! یہ دن دکھلانے سے پہلے خدا مجھے اٹھا لے تو اچھا ہے۔ ماموں بہت دنوں تک حال کہہ کہہ کر دوا لاتے رہے، مگر ٹھیک ہونا تھا نہ ہوئیں۔ اور ایک دن بیماری انھیں لے کر چلی گئی۔ سب لوگ کہتے ہیں نانی کو ہڈّی کی ٹی بی ہو گئی تھی۔ یہ ہڈّی کی ٹی بی کیسے

ہو جاتی ہے؟ اور تو اور، سنا ہے عورتوں کے سینے میں کینسر کی گلٹیاں پڑ جاتی ہیں اور ان کے اُبھار کاٹ دیے جاتے ہیں۔ اے اللہ، ہر عورت کو ایسی بیماریوں سے بچائیو۔"

"سانس روک لیجیے۔" ایکسرے مشین آپریٹر نے کہا۔ اس نے جلدی سے سانس روک لیا۔

ایکسرے کرانے کے بعد جب وہ جمیل کے ہمراہ باہر آئی تو جمیل نے نامانوس سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوے پوچھا، "تم نے کبھی سنیماہال میں فلم دیکھی ہے؟"

اس نے جمیل کی طرف دیکھا۔ اس وقت ان کے چہرے پر شفقت آمیز مسکراہٹ تھی۔ اسے تعجب ہوا۔ "بھائی جان اس طرح پوچھ رہے ہیں جیسے مجھے جانتے ہی نہیں! بھلا میں نے سنیماہال میں فلم کہاں دیکھی۔ جب سے حاجی احمد چچا کے گھر میں ٹی وی آیا ہے، ایک آدھ بار تھوڑی بہت دیکھ لی ہے، وہ بھی سب سے چھپ چھپا کر۔"

"نئیں۔" اس نے جواب دیا۔

"دیکھو گی؟" جمیل کے لہجے میں حددرجہ نرمی اور انکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک تھی۔

اسے فلم دیکھنے کا ایسا شوق نہیں تھا۔ بس ایک اشتیاق سا تھا؛ ہم بھی دیکھیں سنیماہال میں فلم کیسی لگتی ہے۔ اس کا جی چاہا کہہ دے، ہاں دیکھوں گی۔ لیکن پھر خیال آیا، "امّاں نے چلتے وقت کتنی نصیحتیں کی تھیں: کہیں گھومنے نہ لگنا جو دیر ہو جائے، فرمائشیں نہ کرنے لگنا، اور دیکھو -- انھوں نے بھائی جان سے کہا تھا -- اسے بھیڑ میں اکیلے نہ چھوڑ دینا، ہاتھ پکڑے رہنا، اجالے اجالے لوٹ آنا، رات مت کرنا۔ "دیر ہو جائے گی تو امّاں بہت خفا ہوں گی۔ بھائی جان سے تو شاید کچھ نہ کہیں مگر میری خبر لے لیں گی۔ اور ابھی پہنچ کر برتن بھی تو دھونا ہیں۔ صبح جھاڑو نہیں دی تھی۔ امّاں کو فرصت نہ ملی ہو گی جھاڑو دینے کی۔ تو جا کر جھاڑو بھی دینا ہو گی اگر مغرب سے پہلے پہنچ گئے۔"

"کیا خیال ہے؟" جمیل نے پوچھا۔

"دیر ہو جائے گی۔ امّاں ڈانٹیں گی۔" اس نے کہا۔

"امّاں سے کہہ دیں گے، ڈاکٹر کے ہاں دیر ہو گئی۔" جمیل نے مسکراتے ہوے کہا۔

"اوں ہنہ۔" اس نے انکار کیا۔

"خیر، تمھاری مرضی۔ اچھا چلو، کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر لسّی پیتے ہیں۔"

"کھانسی آئے گی۔" اس نے کہا۔

"ہوں، یہ تو ہے۔" جمیل نے کہا۔ "پھر تم خود بتاؤ، کیا کھاؤ گی؟"

"آج بھائی جان اتنی اپنائیت سے کیوں بات کر رہے ہیں؟" اسے حیرت کا احساس ہوا۔ فلم بھی دکھلانا چاہتے ہیں۔ پہلے تو کبھی ایسے بات نہیں کرتے تھے۔" بہرحال--- سچ تو یہ تھا کہ جمیل کی اس نرمی اور محبّت نے اس کے باطن میں ایک ایسی کیفیت جگا دی تھی جس کے بعد بھوک کا احساس رہ گیا تھا نہ پیاس کا۔ نقاب کے پیچھے اس کے خشک ہونٹوں کی پپڑیاں چنکیں اور آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔

"کچھ بھی نہیں کھاؤں گی۔ بس جلدی سے گھر چلیے۔" اس نے رقّت آمیز لہجے میں کہا۔

"اچھا، تو پھر تھوڑے سیب خرید لیتے ہیں۔ بس میں کھا لینا۔" جمیل نے کہا۔

اسے ہنسی آ گئی۔ "اب میں بس میں سب سے چھپا کے سیب کھاؤں گی؟ آج بھائی جان کتنے بدلے نظر آ رہے ہیں۔"

واپسی کے سفر میں جمیل نے کہا، "کھڑکی کی طرف بیٹھ جاؤ۔"

"ادھر ہوا آتی ہے۔" اس نے کہا۔ حالاں کہ اس وقت بڑا حبس تھا۔ اس کے انکار سے جمیل کے چہرے پر کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ ایک اطمینان کے ساتھ کھڑکی کی طرف بیٹھ گئے۔

"یہ سیب پکڑو۔" انھوں نے پولی تھین اس کی طرف بڑھائی اور سٹکنی دبا کر شیشے کا فریم اوپر چڑھا دیا۔ پھر گریبان کے بٹن کھول کر کالر پشت کی طرف اچھال دیا۔ منھ زور ہوا تو جیسے شیشے کے اُس طرف پَر تولے کھڑی تھی؛ بھرّا مار کے اندر آ گئی۔

"بھائی جان جس راستے سے گئے تھے اسی راستے سے واپس آئے۔ وہی خوب اونچی سی عمارت، وہی بڑا سا پارک، گندی تصویروں والا سنیما ہال، آہستہ آہستہ چلتا ہوا بڑا سا پنکھا، اور وہی سب چیزیں جو جاتے وقت دیکھی تھیں۔ اب کوئی مجھ سے کہے، ڈاکٹر کے ہاں اکیلی چلی جاؤ، تو میں بڑے آرام سے چلی جاؤں گی۔ پہلے بس سے اتر کر رکشے پر بیٹھوں گی۔

رکشےوالے سے کہوں گی، مجھے وہاں لے چلو۔ کہاں؟ ہاں، نرالانگر۔ خوب اونچی سی عمارت کے پاس۔ پھر راستے میں سب چیزوں کو خوب غور سے دیکھتی رہوں گی۔ اگر کوئی چیز بھی کم ہو گئی یا کوئی نئی چیز نظر آئی تو سمجھ جاؤں گی کہ رکشےوالے کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔ شور مچا دوں گی۔ پھر جب رکشا اس اونچی سی عمارت کے پاس پہنچ جائے گا تو داہنے ہاتھ والی گلی میں ذرا دور تلک پیدل چلوں گی۔ بھائی جان نے رکشےوالے سے کسی اور راستے کی بات کی تھی۔ مگر وہ دور کا راستا تھا، اسی لیے بھائی جان اس سے نہیں گئے تھے۔ مگر یہ سب سوچنا تو آسان ہے، کرنا بہت مشکل۔ شاید میں نہ جا سکوں۔"

جس وقت وہ لوگ بس سے اتر کے گاؤں کی طرف جا رہے تھے، سورج درختوں کی سبز شاخوں میں اٹکا ہوا تھا اور پرندے بسیرے کے لیے اترنے لگے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ زلزلے کی سی، مانوس آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ اس نے نگاہ اوپر کی۔ دور، آسمان کی طرف، سرمئی دھویں سے آڑی ترچھی شاہراہ سی بن گئی تھی۔

"چلو اچھا ہوا جو اجالے اجالے پہنچ گئے۔ امّاں بھی خوش ہو جائیں گی۔" اس نے سوچا۔ "اب اتنی دور تلک پیدل چلنا پڑے گا۔ یہاں کے رکشےوالے بھی کمبخت سورج ڈوبنے سے پہلے ہی چلے جاتے ہیں۔ آج ساری رات پنڈلیوں میں اینٹھن ہو گی۔ نیند نہیں آئے گی۔"

دُھول سے اَٹا ہوا، نشیب و فراز والا راستا طے کرنے کے بعد جب وہ گندی نالیوں سے دامن بچاتی ہوئی، اپنی گلی سے گزر رہی تھی، اچانک ایک موڑ سے تمیزن بوا نمودار ہوئیں، بےنیازی کے ساتھ، وہی پرانی چال چلتی ہوئی۔ تمیزن بوا کے سر پر بڑا سا تھال رکھا تھا۔ تھال پر ڈھکے ہوے کامدار دوپٹّے کے پلّو ان کے شانوں پر جھُول رہے تھے۔

تمیزن بوا نے تھال پر ہاتھوں کی گرفت مضبوط کی اور پلکیں خوب اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اگر وہ جمیل کے ہمراہ نہ ہوتی تب بھی تمیزن بوا اسے پہچان لیتیں۔

"سلام تمیزن بوا۔" اس نے سلام کیا۔

"جیتی رہو۔" تمیزن بوا نے لرزتی کانپتی آواز میں دعا دی۔ پھر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوے پوچھا، "کہاں سے آئے رہی ہو؟"

اس کا کلیجا دھک سے ہو گیا۔ کیا جواب دیتی؛ پس و پیش میں پڑ گئی۔ جمیل ذرا آگے بڑھ کر رک گئے تھے۔ انھوں نے ترچھی نگاہ سے تمیزن بوا کی طرف دیکھا اور درشت لہجے میں جواب دیا، "کام سے گئے تھے۔"

تمیزن بوا ہڑبڑا گئیں۔ جاتے جاتے انھوں نے خودکلامی کے سے انداز میں کہا، "جَرینہ بٹیا کی منگنی کا جوڑا لیے جائے رہی ہوں۔"

تمیزن بوا کے جانے کے بعد جمیل نے ترچھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ "سلام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ سہم گئی۔ ندامت کے احساس کے ساتھ اس نے سوچا، "بھائی جان صحیح کہہ رہے ہیں۔ مجھے سلام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خاموشی سے آگے بڑھ جاتی تو تمیزن بوا کو شاید پتا بھی نہیں چل پاتا کہ برقعے میں کون تھا۔ مگر اب تو۔۔۔"

اسی وقت امّاں نے انھیں دیکھ لیا۔ اطمینان میں ڈوبا ہوا لمبا سانس لے کر انھوں نے کہا، "خدا کا شکر ہے تم لوگ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر آ گئے۔"

اس نے تیزقدمی کے ساتھ آنگن عبور کیا اور دالان میں پہنچ کر تخت پر ڈھے گئی۔ امّاں جمیل کے پیچھے ان کے کمرے میں اس طرح گئیں جیسے کوئی انتہائی رازداری کی بات پوچھنے گئی ہوں۔

"امّاں کو پہلے مجھ سے میرا حال پوچھنا چاہیے تھا، اور وہ پہنچ گئیں بھائی جان کے پاس۔ امّاں بھی بالکل ہَولاخَبطا ہیں۔"

اتنی دور پیدل چلنے کی وجہ سے اس کی پنڈلیاں پھڑک رہی تھیں اور دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں کہ ذرا دیر کے لیے خودفراموش ہو جائے، لیکن تکان کے احساس نے اس کے ذہن کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ ایک ذرا آنکھ موندتی کہ شہر کے ہنگامہ پرور راستوں میں دیکھی ہوئی چیزیں اور مخلف النّوع آوازیں اس کے پپوٹوں کو جدا کر دیتیں۔ "شہر میں کتنا شور تھا اور یہاں کیسی خاموشی ہے۔" اس نے سوچا۔

کچھ دیر بعد امّاں جمیل کے کمرے سے نکل کر ہولے ہولے اس کے پاس آئیں اور ایک اضمحلال کے ساتھ آہستہ سے تخت پر بیٹھ گئیں۔

"برقع تو اتار دو۔ بہت گرمی ہے۔" امّاں نے کہا۔ "تم نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہو گا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا؛ آنکھیں کھولے اوپر دیکھتی رہی۔

"ان لوگوں کے ساتھ کہیں جاؤ تو کھانے پانی کو بھی ترسا دیتے ہیں۔ چائے بنا لاؤں؟ یا ایک پیالی دودھ پی لو؟"

"اوں ہنہ۔" اس نے سر کو جنبش دی۔

امّاں نے اس کی پیشانی پر اپنی ٹھنڈی ہتھیلی رکھی اور دَم سادھ لیا۔

"حرارت ہو گئی ہے۔ دیکھو بخار بڑھ نہ جائے۔ ذمےداری کا کوئی احساس ہی نہیں۔ صاحب زادے دوا لانا ہی بھول گئے۔ تم نے بھی یاد نہیں دلایا۔ آ جاتی تو آج ہی سے شروع کر دیتیں۔ اب کل شام کو لے کر لوٹیں گے۔ پرسوں صبح سے کہیں جا کر شروع ہو گی۔ بالکل وہی عادتیں ہیں باپ کی جیسی۔ گھر میں مریض کا دم نکل رہا ہو، اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے۔"

"اب امّاں دماغ کے کیڑے گرا دیں گی۔" اس نے سوچا۔ "یہ ذرا ذرا سی باتوں کو اتنا پھینٹتی ہیں، اتنا پھینٹتی ہیں کہ بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں۔ اسی لیے تو ابّا اور بھائی جان کی ڈانٹیں کھاتی ہیں۔"

مگر اس وقت امّاں، شاید اس کی بیماری کی وجہ سے، خاموش ہو گئیں۔ انھوں نے اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی بالوں کی لٹ اوپر کی، دوپٹّے سے پسینا پونچھا اور پائنتی سے پنکھا اٹھا کر جھلنے لگیں۔ سکون کے احساس سے اس کی آنکھیں مُند گئیں۔ لیکن ذرا دیر بعد پنکھے کی رفتار آہستہ آہستہ سست ہونے لگی۔ اس نے کنکھیوں سے امّاں کی طرف دیکھا۔ امّاں کی نظریں کہیں اَور تھیں۔ ان کا چہرہ ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ دیر کے بعد آگ کے سامنے سے اٹھی ہوں۔ آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو رہے تھے اور ہونٹ آہستہ آہستہ تھرتھرا رہے تھے۔

اس وقت عدیل بال اچھالتا ہوا ایک بےنیازی کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ امّاں کو زہرا کے پاس اس طرح بیٹھی ہوئی دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ پھر آہستہ روی کے ساتھ تخت کے پاس آیا۔

"پانی پیوں گی۔" اس نے کہا۔

"بہن کو پانی دو۔" امّاں نے گرفتہ آواز میں کہا۔

عدیل جلدی سے پانی لے آیا۔ "باجی، پانی۔"

کورے گھڑے کا، کھارا مگر ٹھنڈا پانی اس نے تین بار ٹھہر ٹھہر کے پیا، پھر خالی گلاس عدیل کی طرف بڑھایا۔ "اَور۔"

عدیل پھر اسی رفتار کے ساتھ جا کر پانی لے آیا۔ اس نے دوسرا گلاس

بھی تین بار، ٹھہر ٹھہر کے خالی کر دیا۔ پانی سے پیٹ بھر گیا لیکن پیاس نہیں بجھی۔ وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ اسی وقت ابّا کھنکھارتے ہوے آ گئے، مخصوص انداز میں توازن کے ساتھ چلتے ہوے۔ چھتری بند کرتے ہوے انھوں نے کسی قدر تشویش کے ساتھ اس کی طرف دیکھا، پھر چھتری کو کھونٹی میں ٹانگ کر اس کے پاس آئے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے؟" ابّا نے پوچھا۔

"تھک گئی ہے۔" امّاں نے اسی گرفتہ آواز میں جواب دیا۔

"ہوں۔" انھوں نے تفکّر کیا۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولے، "گرمی بھی بہت ہے بھنچو۔ بارش ہو تو کچھ سکون ملے۔ تُو کھڑا کھڑا منھ کیا تک رہا ہے؟ بہن کے پنکھا کیوں نہیں جھل دیتا؟" ابّا نے عدیل کو حکم دیا۔ "لے، پہلے یہ قمیص دھوپ میں پھیلا دے۔"

انھوں نے قمیص اتار کے عدیل کو دی۔ قمیص اتارنے کے بعد ابّا زیادہ بارعب، بلکہ خوں‌خوار لگنے لگتے۔ ان کے بدن میں بال بھی تو بہت تھے۔

عدیل نے قمیص دھوپ میں پھیلائی اور پسینے سے چِپچپاتے ہوے ہاتھوں کو سونگھتا ہوا تخت کے پاس آیا۔ پھر امّاں کے ہاتھ سے پنکھا لے کر جلدی جلدی جَھلنے لگا۔

اس نازبرداری سے زہرا کو اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا سب لوگ اسے اکیلا چھوڑ دیں اور اس سے بےنیاز ہو جائیں۔ اس نے برقع بدن سے کھسوٹ کے دور پھینکا۔ اس وقت امّاں اٹھ کر دوسرے دالان میں چلی گئیں۔

"اب امّاں دالان سے نکل کر چوروں کی طرح کوٹھری میں جائیں گی۔ اور وہاں کپڑے نکالنے کے بہانے ایک بکس کھولیں گی، پھر دوسرا کھولیں گی۔ کوئی کپڑا نکالیں گی، اسے پھیلائیں گی، پھر آہستہ آہستہ تِہا کے دوبارہ بکس میں رکھ دیں گی۔ اور دیر تک یہی کرتی رہیں گی۔"

وہ جانتی تھی کہ جب امّاں کو کوئی دکھ ستاتا ہے تو وہ دبے قدموں سے کوٹھری میں جا کر دیر تک آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ اس نے پہلو بدل کر کوٹھری میں دیکھنے کی کوشش کی۔ کوٹھری کے دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا، مگر اندر اندھیرا تھا۔ اسی وقت مرکزی دروازے کی طرف، ڈیوڑھی میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔

"عذرا باجی آ رہی ہیں۔" عدیل نے کہا۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ سامنے عذرا بچّوں کی سی چال چلتی ہوئی آ

رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی مانوس مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ تکان اور تردّد کا جو احساس اس پر غالب تھا، عذرا کو دیکھنے کے بعد ایک توانائی میں دب گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ابّا کمر پہ دھوتی باندھ کے پاجامہ اتار رہے تھے۔ بےقراری کو دبا کے وہ تخت پر سے اتری اور کسی قدر محتاط انداز سے چلتی ہوئی عذرا کے قریب چلی گئی۔ اگر ابّا سامنے نہ ہوتے تو بچوں کی طرح دوڑ کر عذرا کے چپٹ جاتی۔

"آج میں نے تم کو یاد کیا، اور تم آ گئیں۔ کب آئیں؟" اس نے عذرا کو سرتاپا دیکھا۔ نئی وضع کے کپڑے عذرا پر بہت سج رہے تھے۔ اب اس کا رنگ بھی پہلے سے نکھر آیا تھا۔

"آج دوپہر ہی کو آئی ہوں۔ میں اُسی وقت تم سے ملنے آئی تھی، مگر تم ملیں ہی نہیں۔ کہاں گئی تھیں؟" عذرا نے پوچھا۔

اس کا کلیجا تو جیسے حلق میں آ کر اٹک گیا۔ اب وہ عذرا کو کیا بتاتی۔ بات بنانا اسے آتی نہیں تھی۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی کہ امّاں کوٹھری سے نکلیں۔ ایسے موقعے پر ان کی چھٹی حس فوراً بیدار ہو جایا کرتی تھی۔ وہ بلّی کی سی چال چلتی ہوئی اس کے پاس آئیں۔ "سنو زہرا!" انھوں نے رازدارانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا اور دالان میں چلی گئیں۔

"امّاں ایسی ہی باتیں کرتی ہیں۔" اس نے سوچا۔ "اب بھلا عذرا کے پاس سے اس طرح بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ کیا سوچے گی؟"

"عذرا، بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے عذرا سے کہا اور بادلِ ناخواستہ دالان میں چلی گئی۔ وہاں امّاں آنکھیں پھاڑے اس طرح کھڑی تھیں جیسے کوئی حادثہ ہونے والا ہو۔

"دیکھو، یہ بڑی ڈائن لڑکی ہے۔ اپنی ماں کی طرح رسّی کا سانپ بنا دینے والی۔ یہ ٹوہ لینے آئی ہے۔ تم سے بہت سی باتیں پوچھے گی، مگر خبردار جو تم نے اس سے کوئی بات بتلائی۔ کسی بات کا جواب نہ دینا۔ ہونٹ پر ہونٹ رکھے بیٹھی رہنا، خود ہی چلی جائے گی۔ سمجھ گئیں؟" امّاں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اقرار کروا لینا چاہتی ہوں۔ اس نے تیوریاں چڑھا کر امّاں کو دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں۔

"اور ذرا اپنا حلیہ تو ٹھیک کرو۔" امّاں نے کہا اور بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ "کمبخت بَیل کا گرنا اور سپاہی کا آنا۔"

عذرا کو دیکھ کر اس کے دل میں خوشی اور طمانیت کا جو احساس

پیدا ہوا تھا، جاتا رہا، اور اس کی جگہ وہی اکتاہٹ اور بیزاری کی کیفیت لوٹ آئی۔ وہ کچھ دیر تک تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی، پھر تیزقدمی سے جا کر چارپائی پر لیٹ گئی اور دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر زاروقطار رونے لگی۔ کچھ دیر بعد اندھیرا ہو گیا اور مغرب کی اذان ہوئی۔ جلدی سے اٹھی۔ ایک طویل، سسکتا ہوا سانس لے کر اس نے سوچا، "آج مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مغرب کی اذان ہو رہی ہے اور گھر میں اندھیرا ہے۔ کمبخت ماری بجلی پتا نہیں کب آئے گی۔" وہ جلدی سے آنگن میں آئی، ٹھٹھک کر سر پر دوپٹا ڈالا، آنکھوں میں رہ جانے والی نمی کو دوپٹے کے آنچل سے خشک کرتی ہوئی حسبِ معمول چراغ جلانے باورچی خانے کی جانب چل پڑی۔

(بہ شکریہ "سوغات"، بنگلور)

انتخاب

آئزک باشیوِس سِنگر

آئزک باشیوِس سنگر (Isaac Bashevis Singer)

آئزک باشیوِس سنگر ۱۹۰۴ میں پولینڈ میں پیدا ہوے۔ ان کے والد اور دادا ربی تھے۔ سنگر کی تعلیم بھی وارسا کے یہودی دینی ادارے میں ہوئی۔ ۱۹۳۵ میں سنگر امریکا منتقل ہو گئے اور نیویارک سے یدش زبان میں شائع ہونے والے ایک رسالے سے وابستگی اختیار کر لی۔ ابتدائی تحریروں سے قطع نظر، جو وارسا میں شائع ہوئی تھیں، سنگر نے اپنا تقریباً تمام تر فکشن اسی رسالے میں شائع کوایا، اور خاصے طویل عرصے تک ان کی تحریریں یدش پڑھنے والوں تک محدود رہیں۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں کے انگریزی ترجمے بہت بعد میں ہوے اور تب ہی انھیں عام شہرت اور تحسین حاصل ہوئی۔ سنگر کو ۱۹۷۸ کا نوبیل ادبی انعام دیا گیا۔

سنگر کو جدید دور کے حقیقت نگار کہانی کاروں میں بجا طور پر ایک نہایت ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات اور کردار بیشتر ان کی یادوں اور مشاہدوں سے ماخوذ ہیں۔ ان کا محلِ وقوع یا تو پولینڈ ہے یا امریکا، جہاں پولینڈ سے آئے ہوے تارکینِ وطن آباد ہیں۔ اپنے مخصوص پس منظر کو بیحد خوبی سے کام میں لاتے ہوے سنگر نے ان کرداروں کے ذریعے انسانی تجربے اور صورتِ حال کو گرفت میں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اسی بنا پر ان کی کہانیاں دنیا بھر کے پڑھنے والوں کے لیے اس قدر پُرکشش ہیں۔ یہ موضوعات اور کردار انوکھے نہیں، جانے پہچانے ہیں۔ عشق، رقابت، بےرحمی، ذہنی اور مادّی دنیا کا تضاد، اور سیاست کے ہاتھوں انسان کی دُرگت -- یہ اور ان جیسے دوسرے موضوعات زندگی کی طرح قدیم ہیں اور سنگر نے انھی موضوعات کو فنکارانہ چابکدستی سے نہایت دلچسپ کہانیوں کی شکل دی ہے۔

سنگر کی تحریر کی سب سے نمایاں خوبی اس کی سادگی ہے، لیکن یہ محض حقائق کا بیان کرنے والی جامد سادگی نہیں۔ ساخت کے اعتبار سے ان کی بعض کہانیاں قدیم قصّوں سے مماثل ہیں، اور بعض حقیقت نگاری کے عمومی اسلوب کے مطابق ایک نادیدہ قصّہ گو کی زبانی بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن سنگر کی سب سے دلکش کہانیاں وہ ہیں جن میں مصنّف خود، کہانی کہنے والے کی نہیں بلکہ کہانی سننے والے کی حیثیت سے، موجود ہوتا ہے۔ یہ انداز سنگر کی ایجاد نہیں، لیکن انھوں نے اسے یقیناً اپنے فنّی مقاصد سے ہم آہنگ پایا ہے اور اس کا بھرپور اور کامیاب استعمال کیا ہے۔ کہانی کی یہ ساخت کرداروں سے مطلوبہ فاصلہ بھی فراہم کرتی ہے اور دوسری جانب مکالمے کا رنگ اختیار کر کے مصنّف کی اپنی زندگی کے قصّے میں بھی جذب ہوتی جاتی ہے۔

سنگر کا یہ انتخاب پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے جن کا ترجمہ راشد مفتی نے کیا ہے۔ ان میں سے تین کہانیوں کا خاص طور پر اس انتخاب کے لیے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ "آج" کے لیے مارکیز کی دو کہانیوں کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ انھوں نے سنگر کے علاوہ سال بیلو اور برنارڈ میلامُڈ کی کہانیوں کے ترجمے کیے ہیں۔ ان کے ترجموں کا ایک مجموعہ "بازیافت" کے نام سے زیرِطبع ہے۔

آئزک باشیوس سنگر

انگریزی سے ترجمہ : راشد مفتی

مارکیٹ اسٹریٹ کا اسپینوزا

۱

ڈاکٹر ناہم فِشلسن وارسا کی مارکیٹ اسٹریٹ پر واقع اپنے بالاخانے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ خاکستری داڑھی والا پستہ قد اور کبڑا شخص تھا جو گدّی پر باقی رہ گئے دو چار بالوں کے سوا بالکل گنجا تھا۔ اس کی ناک چونچ کی طرح خمیدہ اور آنکھیں کسی جسیم پرندے کی سی بڑی بڑی اور مضطرب تھیں۔ وہ گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی شام تھی لیکن ڈاکٹر فشلسن ایک سیاہ کوٹ میں ملبوس تھا، جو اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہا تھا، اور اس نے کلف دار کالر اور بو لگا رکھی تھی۔ وہ دروازے سے دریچے تک، جو اس ڈھلواں کمرے کے اونچے حصّے کی دیوار میں تھا، آہستہ آہستہ جاتا اور واپس آتا۔ کمرے سے باہر جھانکنے کے لیے کئی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ میز پر پیتل کے شمع دان میں ایک شمع روشن تھی اور شعلے کے گرد طرح طرح کے پتنگے رقصاں تھے۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی آگ کے بہت قریب آ جاتا اور اپنے پَر جُھلسا لیتا، یا کوئی لَو کی زد میں آ کر لمحےبھر کے لیے دمک اٹھتا۔ ایسے لمحوں میں ڈاکٹر فِشلسن منھ بنا لیتا۔ اس کا جھرّیوں بھرا چہرہ پھڑک اٹھتا اور وہ اپنی بےترتیب مونچھوں کے نیچے اپنے ہونٹ چبانے لگتا۔ آخرکار اس نے جیب سے رومال نکالا اور اسے پتنگوں پر ہلانے لگا۔

"یہاں سے ہٹو، احمقو، نادانو!" اس نے سرزنش کی۔ "یہاں تمھیں حرارت نہیں ملے گی، تم صرف اپنےآپ کو جلا بیٹھو گے۔"

پتنگے منتشر ہو گئے لیکن اگلے ہی لمحے لوٹ آئے اور ایک بار پھر، کپکپاتے ہوئے شعلے کا طواف کرنے لگے۔ ڈاکٹر فِشلسن نے اپنی شکنوں بھری

پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوے آہ بھری۔ "انسانوں کی طرح یہ بھی لمحاتی حَظ سے زیادہ کچھ اور نہیں چاہتے۔" میز پر ایک لاطینی کتاب کھلی ہوئی پڑی تھی جس کے چوڑے حاشیوں والے صفحوں پر چھوٹے چھوٹے حروف میں ڈاکٹر فِشلسن کی لکھی ہوئی یادادشتیں اور تبصرے تھے۔ یہ اِسپینوزا کی کتاب "اخلاقیات" تھی جس کا مطالعہ ڈاکٹر فِشلسن گزشتہ تیس سال سے کر رہا تھا۔ اسے ہر قضیہ، ہر دلیل، ہر نتیجہ اور ہر یادداشت زبانی یاد تھی۔ جب وہ کسی خاص اقتباس تک پہنچنا چاہتا تو عموماً تلاش کیے بغیر فوراً اسی مقام پر کتاب کھول لیتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہر روز گھنٹوں، اپنے استخوانی ہاتھ میں محدّب عدسہ لیے اور تائید میں بڑبڑاتے اور سر ہلاتے ہوے، "اخلاقیات" کے مطالعے میں مشغول رہتا۔ حقیقت یہ تھی کہ ڈاکٹر فِشلسن جتنا زیادہ پڑھتا اتنے ہی پریشان کن جملے، غیرواضح عبارتیں اور پیچیدہ تصریحات سامنے آتیں۔ ہر فقرہ ایسے ایسے رموز کا حامل ہوتا جن تک اِسپینوزا کا کوئی طالبِ علم نہیں اتر سکا تھا۔ اصل میں اُس فلسفی نے کانٹ اور اس کے پیروکاروں کی جانب سے کی جانے والی عقلِ محض کی تمام تر تنقید کو وقت سے پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ ڈاکٹر فِشلسن "اخلاقیات" کی تفسیر لکھ رہا تھا۔ اس کی درازیں یادداشتوں اور مسوّدوں سے پُر تھیں لیکن نظر نہیں آتا تھا کہ وہ کبھی اپنا کام مکمّل کر سکے گا۔ پیٹ کی بیماری، جس نے اسے برسوں آزار دیا تھا، روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ اب دلیے کے چند نوالے کھانے ہی سے اس کے پیٹ میں درد اٹھنے لگتا۔ "خدائےبرتر، یہ مشکل ہے، بہت مشکل۔" وہ اپنےآپ سے اسی لہجے میں کہتا جو اس کے باپ، تشیوز کے آں‌جہانی ربی، کا تھا۔ "یہ بہت، بہت دشوار ہے۔"

ڈاکٹر فِشلسن مرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ وہ اب جوان نہیں رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ "اخلاقیات" کے چوتھے باب میں بیان ہوا ہے کہ "ایک آزاد آدمی موت سے کم کسی شے کے بارے میں نہیں سوچتا اور اس کی دانائی موت پر نہیں بلکہ زندگی پر تفکّر کا نام ہے۔" تیسرے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ "انسانی ذہن انسانی جسم کے ساتھ مکمّل طور پر فنا نہیں ہو سکتا اور اس کا کچھ حصّہ ایسا ہوتا ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے۔" مگر اس سب کے باوجود ڈاکٹر فِشلسن کو اس کا اَلسر (یا شاید وہ کینسر تھا) پریشانی میں مبتلا کیے رکھتا۔ اس کی زبان پر ہمیشہ ایک تہہ چڑھی رہتی۔ وہ باربار ڈکاریں لیتا اور ہر بار ایک مختلف بدبودار گیس خارج کرتا۔

وہ اکثر سینے کی جلن اور اعضا کی اکڑن کا شکار رہتا۔ بعض اوقات اس کا جی متلاتا اور بعض اوقات اسے لہسن، پیاز اور تلی ہوئی چیزوں کی خواہش ہونے لگتی۔ وہ ڈاکٹروں کی تجویز کی ہوئی دوائیں مدّتوں پہلے ترک کر کے اپنا علاج آپ ڈھونڈ چکا تھا۔ اس نے کھانے کے بعد کچلی ہوئی مُولی کا استعمال سودمند پایا تھا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد پیٹ کے بل لیٹ جاتا اور سر کو پہلو میں ڈھلکا لیتا۔ لیکن یہ گھریلو علاج صرف عارضی افاقہ دیتے تھے۔ کچھ ڈاکٹر، جن سے اس نے مشورہ کیا تھا، مصر تھے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ "یہ صرف اعصابی معاملہ ہے،" انھوں نے اسے بتایا تھا۔ "تم سو سال کی عمر تک جی سکتے ہو۔"

لیکن گرمیوں کی اُس تپتی ہوئی رات کو ڈاکٹر فِشلسن محسوس کر رہا تھا کہِ اس کی طاقت جواب دیتی جا رہی ہے۔ اس کے گھٹنے لرز رہے تھے اور نبض دھیمی پڑ گئی تھی۔ وہ پڑھنے بیٹھا تو اس کی نظر دھندلا گئی۔ صفحے پر ثبت الفاظ سبز سے سنہری ہو گئے۔ سطریں سفید خلا چھوڑتی ہوئی لہرا کر ایک دوسرے کو پھلانگ گئیں، گویا متن کسی پُراسرار طریقے سے غائب ہو گیا ہو۔ ٹین کی چھت سے براہِ راست اترتی ہوئی حدّت ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر فِشلسن اپنےآپ کو کسی تنور کے اندر محسوس کر رہا تھا۔ وہ کئی بار چار سیڑھیاں چڑھ کر دریچے تک گیا اور شام کی ٹھنڈی پڑتی ہوئی ہوا میں اپنا سر باہر نکالا۔ وہ اس حالت میں اتنی دیر تک رہتا کہ اس کے گھٹنے لچک جاتے۔ "واہ، کیا اچھی ہوا ہے،" وہ بڑبڑاتا، "واقعی فرحت بخش!" اور اسے یاد آتا کہ اِسپینوزا کے مطابق اخلاق اور مسرت کو مماثل ہیں اور یہ کہ سب سے بڑا اخلاقی عمل جو کوئی شخص کر سکتا ہے، کسی ایسی خوشی کا پورا کرنا ہے جو تعقّل کے خلاف نہ ہو۔

۲

دریچے کی آخری سیڑھی پر کھڑے ہو کر باہر جھانکتے ہوے، ڈاکٹر فِشلسن دو دنیاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اوپر ستاروں بھرے افلاک تھے۔ ڈاکٹر فِشلسن نے کبھی سنجیدگی سے فلکیات کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن ہمارے کرے کی طرح سورج کے گرد گھومتے ہوے سیّاروں کو اپنی جگہ پر ساکن ستاروں سے ممیّز کر سکتا تھا جو خود دوراُفتادہ سورج ہیں جن کی روشنی

ہم تک سو، بلکہ ہزار سال میں پہنچتی ہے۔ وہ ستاروں کے ان جُھرمٹوں کو جو خلا میں زمین کا راستا متعیّن کرتے ہیں، اور اس سحابی پٹکے کو جو کہکشاں کہلاتی ہے، پہچانتا تھا۔ ڈاکٹر فِشلسن کے پاس ایک چھوٹی سی دوربین تھی جو اس نے اپنے زمانۂ تعلیم میں سوئٹزرلینڈ میں خریدی تھی۔ وہ اس کے ذریعے چاند کو دیکھ کر خاص طور پر لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ چاند کی سطح پر، سورج کی روشنی اور تاریکی میں نہائے ہوے آتش فشاں اور ان کے سایہ دار دہانے واضح طور پر پہچان سکتا تھا۔ وہ ان شگافوں اور درزوں کو دیکھنے سے کبھی نہیں تھکتا تھا کہ یہ اسے بیک وقت نزدیک اور دور، بیک وقت حقیقی اور غیرحقیقی معلوم ہوتے تھے۔ کبھی کبھی وہ کسی ٹوٹتے ہوے ستارے کو آسمان پر ایک وسیع قوس بنا کر اپنے پیچھے شعلہ فِشاں راستا چھوڑتے ہوے غائب ہوتے دیکھتا۔ تب ڈاکٹر فِشلسن جان جاتا کہ کوئی شہابی حجر ہماری فضا میں پہنچ گیا ہے اور اس کا کوئی اَن جلا ٹکڑا غالباً سمندر یا صحرا یا شاید کسی غیرآباد علاقے میں گرا ہے۔ ڈاکٹر فِشلسن کے کمرے کی چھت کی اوٹ سے نمودار ہونے والے ستارے آہستہ آہستہ بلند ہوے، یہاں تک کہ سڑک کے اُس پار کے مکان کے اوپر چمکنے لگے۔ ہاں، ڈاکٹر فِشلسن جب آسمانوں پر نظر ڈالتا تو اُس لامحدود وسعت سے باخبر ہو جاتا جو، بقولِ اسپینوزا، خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ اس یہ خیال تقویت دیتا کہ ایک کم زور اور پست قامت شخص ہونے کے باوجود، جو مطلق لامحدود جوہر کے محض ایک بدلتے ہوے انداز سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا، وہ اس حد تک نظامِ کائنات میں شامل ہے کہ خود اُلوہیت کا جُز ہے، اور اُسی مادّے سے وجود میں آیا ہے جس سے اجرامِ فلکی بنے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے فنا نہیں ہے۔ ایسے لمحوں میں ڈاکٹر فِشلسن عقلی محبّت (amor dei intellectualis) کے تجربے سے گزرتا جو ایمسٹرڈیم کے فلسفی کے بقول ذہن کی اَرفع ترین کیفیت ہے۔ ڈاکٹر فِشلسن نے چند گہری سانسیں لیں اور سر کو، جہاں تک اس کا اکڑا ہوا کالر اجازت دیتا تھا، بلند کیا۔ اس نے اپنےآپ کو زمین، سورج، کہکشانی ستاروں اور ان لامحدود اور لاتعداد کہکشاؤں کے ساتھ، جو صرف لامتناہی تفکّر کی گرفت میں آ سکتی ہیں، واقعتاً گردش میں محسوس کیا۔ اس کی ٹانگیں ڈھیلی اور بےوزن ہو گئیں اور اس نے دریچے کے چوکھٹے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، گویا اسے اپنے قدموں کے اکھڑ جانے اور اپنے جسم کے، باہر، ابدیت کی جانب. پرواز کر

جانے کا خوف ہو۔

جب ڈاکٹر فشلسن آسمان کے مشاہدے سے اکتا گیا تو اس نے نیچے مارکیٹ اسٹریٹ پر نظر ڈالی۔ اس کے سامنے یاناش مارکیٹ سے لے کر آئرن اسٹریٹ تک پھیلی ہوئی ایک لمبی پٹّی تھی جس کے کنارے پر لگے ہوے گیس کے لیمپ آتشیں نقطوں کی لڑی میں پروئے ہوے معلوم ہو رہے تھے۔ ٹین کی کالی چھتوں پر نصب چِمنیوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ نانبائی اپنے تنور دہکا رہے تھے۔ کہیں کہیں شرارے سیاہ دھویں میں گم ہو رہے تھے۔ بازار گرمیوں کی شام جیسا پُرشور اور پُرہجوم اور کبھی نہیں ہوتا تھا۔ چوک میں، جو اوپر سے خشخشی بسکٹ کی طرح دکھائی دیتا تھا، چور، طوائفیں، جُواری اور چوری کا مال خریدنے والے دفع الوقتی کر رہے تھے۔ نوجوان بھونڈےپن سے قہقہے لگا رہے تھے اور لڑکیاں چیخیں مار رہی تھیں۔ ایک پھیری والا، پیٹھ پر سکنجبین کا پیپا اٹھائے، عام غل غپاڑے کو اپنے وقفہ دار آوازوں سے چیر رہا تھا۔ ایک تربوزفروش وحشیانہ آواز میں چلّا رہا تھا اور اس کا تربوز کاٹنے والا چاقو لہورنگ رَس میں ڈوبا ہوا تھا۔ کبھی کبھی بازار اور زیادہ ہیجان زدہ ہو جاتا۔ پہلے آگ بجھانے والے انجن اپنے بھاری پہیے ٹھنٹھناتے ہوے تیزی سے گزرے؛ انھیں قوی ہیکل سیاہ گھوڑے کھینچ رہے تھے جنھیں بےقابو ہونے سے روکنے کے لیے لگام سختی سے کھینچ کر رکھنی پڑتی تھی۔ اس کے بعد ایک ایمبولینس آئی جس کا سائرن پوری آواز سے گونج رہا تھا۔ پھر کچھ غنڈے آپس میں لڑ پڑے اور پولیس کو بلانا پڑا۔ ایک راہ گیر لُوٹا گیا تھا اور مدد کے لیے چلّاتا ہوا ادھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ ایندھن کی لکڑی سے بھری کچھ گاڑیاں نانبائیوں کے احاطے میں داخل ہونا چاہتی تھیں لیکن گھوڑے ڈھلواں پُشتیبانوں پر سے پہیے گزارنے سے قاصر تھے، اور گاڑی بان جانوروں کو بُرابھلا کہتے ہوے ان پر چابک برسا رہے تھے۔ زمین سے ٹکراتے ہوے سُموں سے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ دُکانیں بند ہونے کا، یعنی سات بجے کا وقت گزرے کافی دیر ہو چکی تھی۔ لیکن کاروبار تو حقیقت میں اب شروع ہوا تھا۔ گاہکوں کو چوری چھپے، پچھلے دروازوں سے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ بازار میں موجود روسی سپاہی، جنھیں ان کا حصّہ مل چکا تھا، اس سے صَرفِ نظر کر رہے تھے۔ بیوپاری، جو ایک دوسرے سے زیادہ بلند آواز لگانا چاہتے تھے، اپنا مال اٹھائے پھر رہے تھے۔

"سونا، سونا، سونا،" ایک عورت، جو سڑے ہوے مالٹے بیچ رہی تھی،

چلّائی۔

"چینی، چینی، چینی،" زیادہ پکے ہوے آلوبخاروں کا ایک بیوپاری ٹرّایا۔

"سِریاں، سریاں، سِریاں،" ایک لڑکا، جو مچھلی کے سر بیچ رہا تھا، گرجا۔

سڑک کے پار ایک دینی مدرسے کی کھڑکی میں ڈاکٹر فِشلسن کو مقدّس کتابوں پر جھکے ہوے دراززلف لڑکے نظر آ رہے تھے جو رونی صورتیں بنائے، گنگناتی آوازوں میں زور زور سے سبق پڑھ رہے تھے۔ نیچے مےخانے میں قسائی، قلی اور پھل والے بیئر پی رہے تھے۔ مےخانے کے کھلے دروازے میں سے بخارات حمّام سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی طرح نکل رہے تھے، اور پُرشور موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ دروازے کے باہر طوائفیں مدہوش سپاہیوں اور کارخانوں سے لوٹتے مزدوروں پر جھپٹ رہی تھیں۔ لوگ اپنے کاندھوں پر لکڑیوں کے گٹھے اٹھائے لیے جا رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر ڈاکٹر فِشلسن کو اُن گناہ گاروں کا خیال آیا جنھیں دوزخ میں اپنی آگ خود روشن کرنی ہو گی۔ بھاری آوازوں والے گراموفون اپنی کھردری صدائیں کھلی کھڑکیوں سے باہر انڈیل رہے تھے۔ تہواری عبادت کے نغمے اور غنائی ناٹکوں کے عامیانہ گیت باری باری ایک دوسرے کی جگہ لے رہے تھے۔

ڈاکٹر فِشلسن نے اس نیم روشن پاگل خانے کو بغور دیکھا اور پھر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس ہجوم کا طرزِعمل تعقّل کی عین ضد ہے۔ لاحاصل خواہشوں میں غرق یہ لوگ جذبات سے مدہوش تھے اور، اِسپینوزا کے مطابق، جذبہ کبھی راستی پر نہیں ہوتا۔ اُس مسرّت کے بجائے جس کے یہ متلاشی تھے، اگر کچھ حاصل کرنے میں کامیاب تھے تو صرف جہالت کی عطاکردہ بیماری اور قید، ندامت اور تکلیف۔ یہاں کی چھتوں پر بھٹکنے والی بلّیاں تک، شہر کے دوسرے علاقوں کی نسبت، زیادہ وحشی اور ہیجانی نظر آتی تھیں۔ وہ دردِزہ میں مبتلا عورتوں کی سی آوازوں میں چلّاتیں اور بھوتوں کی طرح دیواروں پر چڑھ کر اولتیوں اور چھجّوں پر کودتیں۔ ایک بِلّا ڈاکٹر فِشلسن کے دریچے پر رکا اور ایسی چیخ نکالی کہ ڈاکٹر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ دریچے سے نیچے آیا اور ایک جھاڑو اٹھا کر اس درندے کی چمکتی ہوئی سبز آنکھوں کے آگے تہدیدی انداز میں لہرانے لگا۔ "فُضلہ خور، دفع ہو! جاہل وحشی!" وہ جھاڑو کا دستہ چھت پر مارتا رہا یہاں تک کہ بِلّا بھاگ گیا۔

۳

جب ڈاکٹر فِشلسن زیورِخ سے، جہاں اس نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی تھی، وارسا لوٹا تو اس کے لیے ایک درخشاں مستقبل کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ اس کے دوستوں کو معلوم تھا کہ وہ اِسپینوزا پر ایک اہم کتاب لکھ رہا ہے۔ یہودیوں کے ایک پولِش جریدے نے اسے لکھنے کی دعوت دی تھی۔ اسے کئی مالدار گھرانوں میں اکثر مدعو کیا جاتا تھا اور وارسا کی عبادت گاہ کے کتب خانے کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا۔ گو کہ اُن دنوں بھی اسے دائمی کنوارا سمجھا جاتا تھا، پھر بھی رشتہ سازوں نے اسے کئی دولت مند لڑکیوں کے رشتے پیش کیے تھے۔ مگر ڈاکٹر فِشلسن نے ان موقعوں سے فائدہ نہیں اٹھایا کیوں‌کہ وہ اِسپینوزا کی طرح آزاد رہنا چاہتا تھا۔ اور وہ اسی طرح رہا۔ لیکن اپنے ملحدانہ خیالات کے باعث اس کا ربی سے جھگڑا ہو گیا اور اسے کتب خانے کی ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اس کے بعد وہ برسوں نجی طور پر عبرانی اور جرمن کی تدریس کر کے گزراوقات کرتا رہا۔ پھر جب وہ بیمار پڑا تو برلِن کی یہودی برادری نے اس کے لیے پانچ سو مارک سالانہ کی امداد منظور کی۔ یہ کام معروف ڈاکٹر ہِلڈے شمیر کی کوشش سے ممکن ہوا تھا جس سے اس کی فلسفے کے موضوع پر خط و کتابت تھی۔ اتنے قلیل وظیفے میں گزارا کرنے کے خیال سے ڈاکٹر فِشلسن ایک دوچھتّی میں اٹھ آیا تھا اور مٹّی کے تیل کے چولھے پر اپنا کھانا خود پکانے لگا تھا۔ اس کے پاس بہت سی درازوں والی ایک الماری تھی جس کی ہر دراز پر اُس چیز کے نام کا لیبل لگا ہوا تھا جو اس کے اندر رکھی تھی: گیہوں، چاول، جَو، پیاز، مولی، آلو، کھُمبیاں۔ ہفتے میں ایک بار وہ، چوڑے گھیر کا سیاہ ہیٹ پہنے، ایک ہاتھ میں ٹوکری اور دوسرے میں "اخلاقیات" اٹھائے، سوداسلف لینے بازار جاتا، اور جب تک اس کا سودا تُلتا وہ "اخلاقیات" کے مطالعے میں محو رہتا۔ دُکان دار اسے جانتے تھے، سو اسے اپنی طرف بلاتے۔

"بہت عمدہ پنِیر آیا ہے، ڈاکٹر، منھ میں رکھتے ہی گھُل جاتا ہے۔"

"تازہ کھمبیاں، ڈاکٹر، براہِ راست جنگل سے منگوائی ہیں۔"

"ڈاکٹر کو راستا دیجیے، خواتین۔" قسائی چلّاتا۔ "مہربانی کر کے دروازہ مت روکیے۔"

اپنی بیماری کے ابتدائی برسوں تک ڈاکٹر فِشلسن ہر شام ایک کیفے میں جایا کرتا تھا جہاں عبرانی کے استاد اور دوسرے دانشور اکثر آیا کرتے تھے۔ وہاں بیٹھ کر کافی کا نصف گلاس پیتے ہوے شطرنج کھیلنا اس کی عادت رہی تھی۔ بعض اوقات وہ ہولی کراس اسٹریٹ پر واقع کتابوں کی دُکانوں پر ٹھہر جاتا جہاں ہر قسم کی پُرانی کتابیں اور رسالے سستے داموں مل جاتے تھے۔ ایک موقعے پر اس کے ایک سابق شاگرد نے ایک ریستوراں میں اس کے ساتھ شام کے وقت ملاقات رکھی تھی۔ جب ڈاکٹر فِشلسن وہاں پہنچا تو دوستوں اور مدّاحوں کی بھیڑ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ انھوں نے مجبور کر کے اسے میز کے کونے کی نمایاں نشست پر بٹھایا تھا اور اس کے بارے میں تقریریں شروع کر دی تھیں۔ لیکن ان باتوں کو بیتے زمانہ ہو چکا تھا۔ اب لوگوں کو اس سے دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ ان نے خود کو لوگوں سے مکمّل طور پر الگ کر لیا تھا اور اب وہ ایک فراموش کردہ شخص تھا۔ ۱۹۰۵ کے واقعات نے -- جب مارکیٹ اسٹریٹ کے لڑکوں نے ہڑتالیں منظّم کرنا، تھانوں پر بم پھینکنا اور ہڑتال توڑنے والوں کو گولی مارنا شروع کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں دُکانیں کام کے دنوں میں بھی بند رہنے لگی تھیں -- اس کی عُزلت نشینی کو اَور بڑھا دیا تھا۔ وہ جدید یہودی سے وابستہ ہر شے -- صہیونیت، اشتمالیت، نِراجیت -- کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ مذکور نوجوان اسے جہلا کا ایک ایسا ہجوم معلوم ہوتے تھے جو سماج کو، جس کے بغیر کوئی معقول بقا ممکن ہی نہیں، تاراج کرنے پر تُلا بیٹھا تھا۔ وہ اب بھی گاہے گاہے ایک عبرانی جریدہ پڑھا کرتا تھا، لیکن جدید عبرانی کو تحقیر سے دیکھتا تھا کیوں‌کہ اُس کی جڑیں توریت یا تالمود میں نہیں تھیں۔ پولِش لفظوں کے ہجّے بھی بدل گئے تھے۔ ڈاکٹر فِشلسن کا خیال تھا کہ نام نہاد روحانی لوگ بھی تعقّل کا دامن چھوڑ چکے ہیں اور اب ان کی تمام تر کوششیں عوام النّاس کے سِفلی جذبات کو تسکین دینے پر مرکوز ہیں۔ کبھی کبھی وہ لائبریری میں جا کر فلسفے کی جدید تواریخ پر مغزپچّی کیا کرتا تھا، لیکن اُس نے جان لیا تھا کہ فلسفے کے پروفیسر اِسپینوزا کو سمجھے ہی نہیں تھے۔ وہ اس کے غلط سلط حوالے دیتے اور اپنے منتشر خیالوں کو اُس سے منسوب کر دیتے تھے۔ ہرچند کہ ڈاکٹر فِشلسن جانتا تھا کہ غصّہ ایک ایسا جذبہ ہے جو عقل کے راستے پر چلنے والوں کے شایانِ شان نہیں ہے، پھر بھی وہ مشتعل ہو جاتا اور جلدی سے کتاب بند کر کے پرے دھکیل دیتا۔

"احمق،" وہ بڑبڑاتا، "گدھے، نوآموز،" اور عہد کرتا کہ اب کبھی جدید فلسفہ نہیں پڑھے گا۔

۴

ہر تین ماہ بعد ایک خاص ڈاکیا، جو صرف منی آرڈر تقسیم کرتا تھا، ڈاکٹر فشلسن کو اسّی روبل دے جاتا۔ اسے اپنا سہ ماہی وظیفہ جولائی کے شروع میں ملنے کی توقع تھی لیکن جب دن پر دن گزرتے گئے اور وہ بھوری مونچھوں اور چمک دار بٹنوں والا درازقامت شخص نمودار نہیں ہوا تو ڈاکٹر کو تشویش ہونے لگی۔ اس کے پاس بمشکل ایک گروشن بچا تھا۔ کون جانے -- شاید برلن کی برادری نے اس کی امداد منسوخ کر دی ہو؛ شاید، خدانخواستہ، ڈاکٹر ہلڈے شمیر گزر گیا ہو؛ ممکن ہے ڈاک خانے والوں سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ ڈاکٹر فِشلسن جانتا تھا کہ ہر واقعہ اپنا سبب رکھتا ہے؛ سب کچھ معیّن ہے، سب کچھ ضروری ہے، اور تعقّل پسند آدمی کو پریشان ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کے باوجود پریشانی، مکھیوں کی طرح بھن بھن کرتی ہوئی، اس کے ذہن پر حملہ آور تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر حالات بد سے بدتر ہو گئے تو وہ خودکشی کر لے گا، مگر پھر اسے یاد آیا کہ اِسپینوزا خودکشی پر صاد نہیں کرتا اور اپنے ہاتھوں اپنی جان لینے والوں کو پاگلوں سے نسبت دیتا ہے۔

ایک دن جب ڈاکٹر اجزائے ترکیبی کی ایک کتاب خریدنے کی غرض سے ایک دُکان میں گیا تو اس نے لوگوں کو جنگ کے بارے میں بات کرتے سنا۔ سربیا میں کسی جگہ آسٹریا کے شہزادے کو گولی مار دی گئی تھی اور آسٹریا نے سربیا کو الٹی میٹم دے دیا تھا۔ دُکان کے مالک نے، جو زرد داڑھی اور زرد، گھومتی ہوئی آنکھوں والا نوجوان تھا، اعلان کیا: "ہم جلد ہی ایک جنگ میں الجھنے والے ہیں۔" اس نے ڈاکٹر فِشلسن کو خوراک ذخیرہ کرنے کا مشورہ دیا کیوں‌کہ مستقبلِ قریب میں غذائی قلّت کا اندیشہ تھا۔

سب کچھ بہت تیزی سے وقوع پذیر ہوا۔ ابھی ڈاکٹر فِشلسن یہ بھی طے نہیں کر پایا تھا کہ اخبار پر چار گروشن خرچ کرنا سودمند رہے گا یا نہیں، کہ دیواروں پر لام بندی کے اشتہار لگ گئے۔ ایسے لوگ سڑک پر چلتے

دیکھے جانے لگے جن کے کالروں پر دھات کے گول ٹکڑے اس بات کی علامت تھے کہ انھیں فوج میں بھرتی کیا جا رہا ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کی بین کرتی ہوئی بیویاں چل رہی ہوتیں۔ ایک سوموار کو، جب ڈاکٹر فشلسن اپنے آخری کوپکوں کے عوض کھانے کا کچھ سامان خریدنے نیچے سڑک پر اترا تو اس نے دیکھا کہ دکانیں بند ہیں۔ دکان دار اپنی بیویوں کے ساتھ باہر کھڑے وضاحت کر رہے تھے کہ مال کہیں سے نہیں مل رہا۔ لیکن کئی خاص گاہکوں کو ایک طرف کر کے پچھلے دروازوں سے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ سڑک پر ہر طرف افراتفری تھی۔ پولیس والے، تلواریں بےنیام کیے، گھوڑوں پر سوار، گشت کرتے پھر رہے تھے۔ مےخانے کے گرد، جہاں زار کے حکم سے وسکی کا ذخیرہ نالے میں بہایا جا رہا تھا، ایک خلقت جمع تھی۔

اس خیال سے کہ شاید کوئی مشورہ دینے والا شناسا مل جائے، ڈاکٹر فشلسن اپنے پرانے کیفے میں گیا۔ لیکن ایک بھی شخص ایسا نہیں ملا جسے وہ پہچان سکتا۔ پھر اس نے اس عبادت گاہ کے ربی سے ملنے کا فیصلہ کیا جس کے کتب خانے میں اس نے کام کیا تھا۔ مگر تنگ، شش پہلو ٹوپی والے دربان نے اسے بتایا کہ ربی اپنے کنبے کے ساتھ معدنی چشموں پر گیا ہوا ہے۔ شہر میں ڈاکٹر فشلسن کے اور بھی پرانے دوست تھے لیکن کوئی اسے گھر پر نہیں ملا۔ اتنا پیدل چلنے سے اس کے پاؤں دکھنے لگے تھے، آنکھوں کے آگے سیاہ اور سبز دھبّے ناچ رہے تھے اور اس پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ ٹھہر گیا اور اس کیفیت کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگا۔ راہ گیر اس سے ٹکرانے لگے۔ ہائی اسکول کی ایک سیاہ چشم طالبہ نے اسے ایک سکّہ تھمانے کی کوشش کی۔ گو جنگ ابھی شروع ہی ہوئی تھی مگر سپاہی، مکمّل جنگی وردی میں ملبوس، آٹھ آٹھ کی افقی قطاروں میں کوچ کر رہے تھے۔ وہ گرد میں اٹے اور دھوپ میں جلے ہوے تھے۔ ان کے پہلوؤں میں چھاگلیں بندھی تھیں اور سینوں پر کارتوسوں کی پیٹیاں۔ ان کی رائفلوں پر لگی ہوئی سنگینیں ایک سرد اور سبز روشنی سے چمک رہی تھیں۔ وہ ماتمی آوازوں میں گا رہے تھے۔ سپاہیوں کے ساتھ ساتھ توپیں تھیں جن میں سے ہر ایک کو آٹھ آٹھ گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ توپوں کے اندھے دہانے غمناک دہشت اگل رہے تھے۔ ڈاکٹر فشلسن کا جی متلانے لگا۔ اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھا اور اسے اپنی آنتیں الٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کے چہرے پر ٹھنڈا پسینا پھوٹ بہا۔

"میں مر رہا ہوں،" اس نے سوچا۔ "میرا وقت آ پہنچا ہے۔" تاہم اس نے جوں‌توں اپنےآپ کو گھسیٹ کر گھر پہنچایا اور لوہے کی چارپائی پر لیٹ کر تادیر منہ کھولے ہانپتا رہا۔ یقیناً اس کی آنکھ لگ گئی ہو گی، کیوں‌کہ اس نے خیال کیا کہ وہ اپنے آبائی شہر تشیوز میں ہے۔ اس کا گلا دُکھ رہا ہے اور اس کی ماں گرم نمک بھرا موزہ اس کی گردن پر لپیٹ رہی ہے۔ اسے گھر میں ہونے والی باتیں سنائی دے رہی تھیں، جو موم بتّی کے بارے میں تھیں کہ مینڈک نے کس طرح اسے کتر ڈالا۔ وہ باہر سڑک پر جانا چاہتا ہے لیکن گھر والے جانے نہیں دے رہے، کیوں‌کہ مسیحیوں کا جلوس گزر رہا ہے۔ لمبی عبائیں پہنے ہوئے لوگ، ہاتھوں میں دو دھاری کلہاڑے لیے، آبِ مقدّس چھڑکتے ہوئے، لاطینی میں کچھ گنگنا رہے ہیں۔ صلیبیں چمک رہی ہیں۔ ہوا میں مقدّس شبیہیں لہرا رہی ہیں۔ فضا میں لوبان اور میّت کی بُو پھیلی ہوئی ہے۔ اچانک آسمان لال سرخ ہو گیا اور ساری دنیا جلنے لگی۔ گھنٹیاں بجنے لگیں اور لوگ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ ان کے سروں پر ناگوار آواز میں چیختے ہوئے پرندوں کے غول منڈلا رہے ہیں۔ ڈاکٹر فِشلسن ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ اس کا بدن پسینے سے تر تھا اور گلا واقعی دُکھ رہا تھا۔ اس خواب کا اپنے حالات سے کوئی معقول تعلّق جاننے اور اسے اس کے اصل اور ازلی و ابدی جوہر (sub specics eternitatis) کے طور پر سمجھنے کے لیے اس نے خواب پر سوچ بچار کرنے کی کوشش کی، مگر اس کا کوئی سرپیر ہی نہ تھا۔ "افسوس کہ دماغ ہر قسم کی حماقتوں کی آماج گاہ ہے،" ڈاکٹر فِشلسن نے سوچا۔ "یہ زمین دیوانوں کے قبضے میں ہے۔"

اور اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں، دوبارہ اونگھنے لگا، دوبارہ خواب دیکھنے لگا۔

۵

بظاہر، ابدی قوانین نے ابھی ڈاکٹر فِشلسن کا انجام مقسوم نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر فِشلسن کی دوچھتّی کے بائیں طرف ایک دروازہ ایک اندھیری راہداری میں کھلتا تھا جو ڈبّوں اورٹوکریوں سے اٹااَٹ بھری ہوئی تھی اور جہاں تلی ہوئی پیاز اور کپڑے دھونے کے صابن کی بُو ہر وقت بسی رہتی تھی۔

اس دروازے کے پیچھے ایک غیر شادی شدہ عورت رہا کرتی تھی جسے پڑوسی بلیک دوبی کے نام سے جانتے تھے۔ وہ لمبی اور دبلی پتلی تھی اور نانبائی کے بیلچے کی طرح کالی تھی۔ وہ مردوں کی سی بھاری آواز میں بولتی تھی اور مردوں ہی کے سے جوتے پہنتی تھی۔ اس کی ناک ٹوٹی ہوئی تھی اور بالائی لب پر گہرا رُواں تھا۔ بلیک دوبی نے برسوں روٹیاں، رول اور ٹکیاں بیچی تھیں جو نانبائی اسے عمارت کے دروازے پر پہنچا جاتا تھا۔ لیکن ایک دن اس کا نانبائی سے جھگڑا ہو گیا؛ اس نے اپنا کاروبار بازار میں منتقل کر لیا اور انڈے بیچنے لگی۔ دوبی مردوں کے معاملے میں بدقسمت رہی تھی۔ دو بار اس کی منگنی نانبائی کے شاگردوں سے ہوئی، لیکن دونوں بار انھوں نے منگنی توڑ دی۔ کچھ عرصے بعد اسے ایک بوڑھے کی طرف سے منگنی کی پیش کش ملی۔ اس بوڑھے کو طلاقی ہونے کا دعویٰ تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی بیوی موجود تھی۔ دوبی کا ایک عم زاد، جو موچی تھا، امریکا میں آباد تھا۔ وہ اکثر شیخی بگھارا کرتی کہ اس کا عم زاد اسے جہاز کا کرایہ بھیج رہا ہے۔ لیکن وہ رہی وارسا ہی میں۔ عورتیں اسے متواتر یہ کہہ کر چھیڑا کرتیں: "تمھارے لیے کوئی امید نہیں ہے، دوبی۔ تمھاری قسمت میں کنواری مرنا ہی لکھا ہے۔" دوبی ہمیشہ انھیں یہ جواب دیتی کہ "میں کسی مرد کی غلام بننا ہی نہیں چاہتی۔ میری طرف سے سب جہنّم میں جائیں۔"

اُس سہ پہر دوبی کے نام امریکا سے ایک خط آیا۔ عام طور پر وہ اپنے خط پڑھوانے درزی لیزر کے پاس جاتی تھی، مگر اس دن لیزر کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ سو دوبی کو ڈاکٹر فِشلسن کا خیال آیا جس کے بارے میں دوسرے کرایہ دار سمجھتے تھے کہ اس نے مذہب تبدیل کر لیا ہے، کیوں‌کہ وہ عبادت کے لیے کبھی نہیں جاتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے دروازے پر دستک دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ "شاید ملحد بھی باہر گیا ہوا ہے،" دوبی نے سوچا۔ تاہم اس نے ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا اور اس بار دروازہ تھوڑا سا ہل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو خوف کے مارے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ڈاکٹر فِشلسن اپنے پورے لباس میں بستر پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ موم کی طرح زرد تھا اور نرخرہ نمایاں طور پر اُبھرا ہوا تھا۔ داڑھی چھت کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ دوبی کی چیخ نکل گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر مر چکا ہے۔ لیکن--- نہیں--- اس کا جسم جنبش کر رہا تھا۔ دوبی نے میز پر دھرا گلاس اٹھایا اور، راہداری کو دوڑ کر پار کے، نل سے پانی بھر کر تیزی سے واپس لوٹی۔

اس نے بےہوش آدمی کے چہرے پر پانی چھڑکا۔ ڈاکٹر فشلسن نے اپنے سر کو جنبش دی اور آنکھیں کھول دیں۔

"آپ کو کیا ہوا ہے؟" دوبی نے پوچھا۔ "آپ بیمار ہیں؟"

"نہیں۔ تمھارا بہت بہت شکریہ۔"

"آپ کے گھر والے ہیں؟ میں انھیں بلا لاتی ہوں۔"

"میرے گھر والے نہیں ہیں۔" ڈاکٹر فشلسن نے کہا۔

دوبی سڑک کے اُس پار سے نائی کو بلا لانا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر نے اشارے سے کہا کہ اسے نائی کی مدد درکار نہیں ہے۔ چوں‌کہ انڈے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے دوبی اس دن بازار نہیں جا رہی تھی لہذا اس نے ایک نیک کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بیمار آدمی کو بستر سے اترنے میں مدد دی اور کمبلوں کو تہہ کر دیا۔ پھر اس نے ڈاکٹر فشلسن کے کپڑے بدلوائے اور تیل کے چولھے پر کچھ یخنی تیار کی۔ دوبی کے کمرے میں سورج کبھی داخل نہیں ہوتا تھا مگر یہاں دھوپ کے ٹکڑے پھیکے رنگ والی دیواروں پر جھلملا رہے تھے۔ کمرے کا فرش سرخ رنگ کا تھا۔ بستر کے سرہانے کی طرف ایک آدمی کی تصویر لٹک رہی تھی جس کی گردن کے گرد ایک چوڑا سنجاف تھا اور بال لمبے تھے۔ "اتنا بوڑھا آدمی اور پھر بھی اپنا کمرہ کیسا صاف ستھرا رکھتا ہے۔" دوبی نے پسندیدگی سے سوچا۔ ڈاکٹر فشلسن نے "اخلاقیات" اٹھا کر دینے کو کہا اور دوبی نے ناگواری سے کتاب اسے تھما دی۔ اسے یقین تھا کہ یہ غیریہودیوں کی کوئی کتابِ دعا ہے۔ پھر اس نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ پانی کا مٹکا بھرا اور فرش پر جھاڑو لگائی۔ ڈاکٹر فشلسن نے یخنی پی۔ کھا پی لینے کے بعد جب اس کی جان میں جان آئی تو دوبی نے اس سے خط پڑھنے کو کہا۔

اس نے آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا۔ کاغذ اس کے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا۔ خط نیویارک سے آیا تھا اور دوبی کے عم زاد کا تھا۔ اس نے ایک بار پھر لکھا تھا کہ وہ ایک بہت اہم خط اور امریکا کا ٹکٹ بھیجنے والا ہے۔ اس وقت تک دوبی کو پورا قصّہ ازبر ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے عم زاد کی شکستہ تحریر پڑھنے میں بوڑھے آدمی کی مدد کی۔ "جھوٹ بولتا ہے،" دوبی نے کہا۔ "اسے تو میرے بارے میں بھولے زمانہ ہو گیا۔" شام کو دوبی پھر آئی۔ بستر کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر پیتل کے شمع دان میں ایک موم بتّی جل رہی تھی۔ چھت اور دیواروں پر سرخ گوں سائے لرز رہے تھے۔ ڈاکٹر فشلسن

بستر میں ٹیک لگائے بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ موم بتّی کی سنہری روشنی اس کے ماتھے پر یوں پڑ رہی تھی کہ وہ دو حصّوں میں بٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دریچے میں سے ایک پرندہ اندر آ گیا تھا اور میز پر براجمان تھا۔ ایک لمحے کو دوبی ڈر گئی۔ اس آدمی کو دیکھ کر اسے جادوگرنیاں، سیاہ آئینے اور راتوں کو بھٹکتی اور عورتوں کو دہشت زدہ کرتی ہوئی لاشوں کا خیال آ گیا۔ پھر بھی وہ چند قدم ڈاکٹر کی طرف بڑھی اور اس سے پوچھا، "اب کیسی طبیعت ہے؟ کچھ بہتر ہوے؟"

"قدرے بہتر ہوں۔ شکریہ۔"

"کیا آپ واقعی نومذہب ہیں؟" اس نے پوچھا، حالاں‌کہ اسے ٹھیک سے معلوم بھی نہیں تھا کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں۔

"میں؟ نومذہب؟ نہیں، میں کسی بھی دوسرے یہودی کی طرح یہودی ہوں۔" ڈاکٹر فِشلسن نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کی یقین دہانی نے دوبی کو مزید پُرسکون کر دیا۔ اس نے تیل کی بوتل اٹھائی اور چولھا جلا دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے سے دودھ کا گلاس لائی اور کاشا تیار کرنے بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر فشلسن "اخلاقیات" کا مطالعہ کرتا رہا، لیکن اس شام قضیے اور دلائل، جن کے متعدّد حوالے تشریحات اور دوسرے قضیوں میں موجود تھے، اس کی سمجھ میں ذرا نہیں آئے۔ اس نے کانپتے ہوے ہاتھوں سے کتاب کو اٹھا کر آنکھوں کے قریب کیا اور پڑھنے لگا:
"انسانی جسم کے تغیّرات سے متعلّق خیال میں خود انسانی جسم کا مناسب علم شامل نہیں ہوتا۔۔۔ انسانی ذہن کے تغیّرات کے خیال سے متعلّق نظریات میں انسانی ذہن کا مناسب علم شامل نہیں ہوتا۔"

٦

ڈاکٹر فِشلسن کو یقین تھا کہ اب وہ کسی بھی روز مر جائے گا۔ اس نے اپنی وصیّت لکھ لی تھی جس کی رُو سے اس کی ساری کتابیں اور مسوّدے عبادت گاہ کے کتب خانے کو دیے جانے تھے۔ اس کے کپڑے اور فرنیچر دوبی کے حصّے میں آنے تھے، کہ اس نے ڈاکٹر کی دیکھ بھال کی تھی۔ لیکن موت نہیں آئی۔ بلکہ اس کی صحت بہتر ہو گئی۔ دوبی نے بازار میں اپنا کاروبار سنبھال لیا، لیکن دن میں کئی بار اس کے ہاں آتی، اس کے لیے یخنی تیار کرتی، چائے

کا گلاس دے جاتی اور اسے جنگ کی خبریں سناتی۔ جرمنوں نے کالش، بیندن اور کیتسی چاؤ پر قبضہ کر لیا تھا اور اب وارسا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ وہاں صبح کی خاموشی میں توپوں کی گھن گرج سنائی دیتی تھی۔ دوبی نے بتایا کہ لوگ بڑی تعداد میں ہلاک اور زخمی ہو رہے ہیں۔ "لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں،" اس نے کہا۔ "عورتوں کے لیے کیسی ہولناک بدقسمتی ہے۔"

ہرچند کہ وہ اس کی وجہ بیان نہیں کر سکتی تھی، لیکن بوڑھے آدمی کی دوچھتّی اسے بھاتی تھی۔ سنہرے حاشیے والی کتابیں اٹھا اٹھا کر جھاڑنا اور دریچے کے چھجّے پر رکھ کر انھیں دھوپ دکھانا اسے پسند تھا۔ وہ دریچے کی سیڑھیاں چڑھتی اور دوربین کے ذریعے باہر دیکھا کرتی۔ وہ ڈاکٹر فشلسن سے باتیں کرنے میں بھی مزہ لیتی۔ وہ اسے سوئٹزرلینڈ کے بارے میں بتاتا جہاں اس نے تعلیم پائی تھی۔ ان بڑے شہروں کا ذکر کرتا جہاں سے وہ گزرا تھا؛ ان اونچے پہاڑوں کی باتیں کرتا جو گرمیوں میں بھی برف پوش رہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کا باپ ربی تھا اور باقاعدہ تعلیم شروع کرنے سے پہلے اس نے، یعنی ڈاکٹر فشلسن نے، ایک دینی مدرسے میں پڑھا تھا۔ دوبی نے اس سے پوچھا کہ اسے کتنی زبانیں آتی ہیں، تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ یدِش کے علاوہ عبرانی، روسی، جرمن اور فرانسیسی بول سکتا ہے۔ اسے لاطینی بھی آتی تھی۔ دوبی کو حیرت تھی کہ ایسا پڑھالکھا آدمی مارکیٹ اسٹریٹ کی ایک دوچھتّی میں رہتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیران وہ اس بات پر تھی کہ ڈاکٹر کا خطاب رکھنے کے باوجود وہ نسخے نہیں لکھ سکتا۔ "آپ سچ مچ کے ڈاکٹر کیوں نہیں بن جاتے؟" وہ اس سے پوچھتی۔ "ڈاکٹر تو میں ہوں،" وہ جواب دیتا۔ "کس قسم کے ڈاکٹر؟" "فلسفے کا ڈاکٹر۔" گو اس کی حقیقت کا اسے ذرا بھی اندازہ نہ تھا لیکن اسے محسوس ہوتا کہ یقیناً یہ کوئی اہم چیز ہوتی ہو گی۔ "ہائے میری ماں!" وہ کہتی۔ "کہاں سے پایا ہے آپ نے ایسا دماغ؟"

پھر ایک شام جب دوبی اسے خستہ بسکٹ اور دودھ والی چائے کا گلاس دے چکی تو وہ اس سے دریافت کرنے لگا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے، اس کے ماں‌باپ کون تھے، اور یہ کہ اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ دوبی کو حیرت ہوئی؛ ایسے سوال تو کبھی کسی نے نہیں پوچھے تھے۔ اس نے اپنی کہانی اسے دھیمی آواز میں سنا ڈالی اور گیارہ بجے تک وہاں ٹھہری۔ اس

کا باپ حلال ذبیحے کی دُکان پر قلی کا کام کرتا تھا اور ماں مذبح خانے میں مرغیوں کے پَر اتارتی تھی۔ ان کا کنبہ، نمبر ۱۹، مارکیٹ اسٹریٹ کے ایک تہہ خانے میں رہتا تھا۔ جب وہ دس سال کی ہوئی تو گھریلو خادمہ بن گئی۔ جس آدمی کے پاس وہ کام کرتی تھی وہ رنگ باز تھا اور چوک میں چوروں سے چوری کا مال خریدا کرتا تھا۔ دوبی کا ایک بھائی بھی تھا جو روسی فوج میں چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ اس کی بہن نے پراگا کے ایک گاڑی بان سے شادی کر لی تھی اور زچگی میں مر گئی تھی۔ دوبی نے انقلابیوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے درمیان ۱۹۰۵ کی لڑائیوں کے بارے میں بتایا۔ اس نے اندھے اتچی اور اس کے گروہ، اور دکانوں سے ان کے بھتّا وصول کرنے کا حال سنایا۔ ان غنڈوں کی باتیں بتائیں جو بھتّا نہ ملنے پر ہفتے کی سہ پہر کو چہل قدمی پر آئے ہوئے نوعمر لڑکے لڑکیوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ اس نے ان دلّالوں کے قصّے بھی سنائے جو گاڑیوں میں گھومتے اور عورتوں کو اغوا کرتے تھے کہ انھیں بیونس آئرس لے جا کر بیچ دیں۔ دوبی نے قسم کھا کر بتایا کہ کچھ لوگوں نے اسے چکلے میں بٹھانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ بھاگ نکلی۔ اس نے اپنے ساتھ کی گئی ہزارہا بُرائیاں گِنوائیں۔ اسے لُوٹا گیا تھا؛ اس کے محبوب کو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ ایک بہم پیشہ نے تو ایک بار اس کی ٹکیوں کی ٹوکری میں مٹّی کا تیل انڈیل دیا تھا۔ اس کے اپنے عم زاد نے امریکا جانے سے پہلے اس سے سو روبل ٹھگے تھے۔ توجّہ سے اس کی باتیں سنتا ہوا ڈاکٹر فِشلسن بیچ بیچ میں سوال پوچھتا اور سر ہلا کر بڑبڑاتا۔

"اچھا، تم خدا کو مانتی ہو؟" اس نے آخرکار دوبی سے پوچھا۔

"میں کہہ نہیں سکتی۔" اس نے جواب دیا۔ "اور آپ؟"

"ہاں، میں تو مانتا ہوں۔"

"پھر آپ عبادت گاہ کیوں نہیں جاتے؟" دوبی نے پوچھا۔

"خدا ہر جگہ موجود ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "عبادت گاہ میں، بازار میں، اس کمرے میں۔ ہم بھی خدا کا حصّہ ہیں۔"

"ایسی باتیں مت کریں۔" دوبی نے کہا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

وہ کمرے سے چلی گئی۔ ڈاکٹر فِشلسن کو یقین تھا کہ وہ سونے کے لیے گئی ہے، لیکن وہ حیران تھا کہ اس نے شب بخیر کیوں نہیں کہا۔ "شاید میرے فلسفے نے اسے بھگا دیا ہے،" اس نے سوچا۔ اگلے ہی لمحے اس نے دوبی کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ کسی پھیری والے کی طرح کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے

اندر آئی۔

"میں آپ کو یہ دکھانا چاہتی تھی۔" وہ بولی۔ "یہ میری شادی کے کپڑے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اُونی، ریشمی، مخملی لباس کرسی پر پھیلانا شروع کر دیے۔ وہ باری باری ہر لباس کو اٹھا اٹھا کر اپنے جسم سے لگانے لگی۔ اپنے عروسی لباس کی ہر چیز، جس میں زیرجامہ، جوتے اور موزے بھی شامل تھے، اس نے تفصیل سے دکھائی۔

"میں ضائع کرنے والی نہیں،" اس نے کہا، "بچانے والی ہوں۔ میرے پاس امریکا جانے کے لیے کافی رقم ہے۔"

پھر وہ چپ ہو گئی اور اس کا چہرہ اینٹ کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس نے خوف اور تجسّس کے ساتھ کنکھیوں سے ڈاکٹر فِشلسن کو دیکھا۔ ڈاکٹر فِشلسن پر اچانک لرزہ سا طاری ہو گیا؛ جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔ وہ بولا، "بہت عمدہ! خوب صورت چیزیں ہیں۔" اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ دو انگلیوں سے اپنی داڑھی نوچنے لگا۔ ایک اداس مسکراہٹ اس کے پوپلے چہرے پر کھیلنے لگی اور اس کی بڑی بڑی مضطرب آنکھیں بھی، جو دریچے سے باہر دُور دیکھ رہی تھیں، اداسی سے مسکرانے لگیں۔

۷

جس روز بلیک دوبی نے ربی کے گھر آ کر اعلان کیا کہ وہ ڈاکٹر فِشلسن سے شادی کر رہی ہے تو ربی کی بیوی نے سمجھا کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ لیکن یہ خبر درزی لیزر کو پہلے ہی مل چکی تھی بلکہ نانبائی اور دوسرے دُکان داروں تک پھیل چکی تھی۔ ایسے لوگ بھی تھے جن کے خیال میں "بوڑھی کنواری" بہت خوش قسمت رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر فِشلسن کے پاس ڈھیروں دولت ہے۔ لیکن ایسے بھی تھے جن کی نظر میں ڈاکٹر ایک صَرف شدہ کپوت تھا جو دوبی کو آتشک لگا دے گا۔ گو ڈاکٹر فِشلسن کا اصرار تھا کہ تقریب چھوٹی اور سادہ ہو، لیکن ربی کے گھر پر مہمانوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ نانبائی کے شاگرد، جو عموماً سروں پر کاغذی تھیلے اوڑھے، جانگیے پہنے، ننگے پیر پھرا کرتے تھے، اب ہلکے رنگ کے سوٹ، تِنکوں کے ہیٹ اور زرد جوتے پہنے ہوے تھے اور انھوں نے شوخ رنگ ٹائیاں باندھ رکھی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ بسکٹوں سے بھرے، بڑے بڑے کیک

لائے تھے۔ حالاں‌کہ جنگ کے زمانے میں شراب ممنوع تھی، مگر انھوں نے کہیں سے ووڈکا کی ایک بوتل بھی پیدا کر لی تھی۔ جب دولھادلھن ربی کے کمرے میں داخل ہوے تو ہجوم میں سے ایک بھنبھناہٹ اٹھی۔ عورتوں کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا؛ یہ وہ عورت نہ تھی جسے وہ جانتی تھیں۔ دوبی ایک چوڑے گھیر کا ہیٹ پہنے ہوے تھی جسے شاہ دانوں، انگوروں اور پَروں سے بھرپور طور پر سجایا گیا تھا، اور جو لباس اس نے پہن رکھا تھا وہ سفید ریشم کا تھا اور ایک دُنبالے سے آراستہ تھا۔ اس کے پیروں میں اونچی ایڑی کے سنہری جوتے تھے اور لمبی گردن میں نقلی موتیوں کا ہار۔ صرف یہی نہیں، اس کی انگلیاں انگوٹھیوں اور چمک دار پتھروں سے دمک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر نقاب تھی۔ وہ کم و بیش اُن دولت مند دلھنوں جیسی لگ رہی تھی جو وِیانا ہال میں بیاہی جاتی ہیں۔ نانبائی کے شاگرد تمسخرانہ انداز سے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ جہاں تک ڈاکٹر فِشلسن کا تعلّق ہے، وہ اپنا سیاہ کوٹ اور چوڑے پنجوں والے جوتے پہنے ہوے تھا۔ وہ بمشکل چل پا رہا تھا۔ اس نے دوبی کا سہارا لے رکھا تھا۔ جب اس نے چوکھٹ پر پہنچ کر ہجوم کو دیکھا تو خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگا لیکن دوبی کا سابقہ مالک اس کے قریب آیا اور بولا، "اندر آؤ، آ جاؤ دولھا میاں۔ شرمیلے مت بنو۔ اب ہم سب بھائی ہیں۔"

تقریب شریعت کے مطابق ہوئی۔ ربی نے، جو سائن کی پرانی پوشاک میں تھا، شادی کا معاہدہ تحریر کیا اور پھر اظہارِ رضامندی کے طور پر دولھا اور دلھن سے اپنا رومال چھونے کو کہا۔ اس نے قلم کو اپنے سر پر دھری ہوئی ٹوپی سے پونچھا۔ کئی قلی، جو ضروری تعداد پوری کرنے کو سڑک سے بلائے گئے تھے، چھپرکھٹ کو سہارے ہوے تھے۔ ڈاکٹر فِشلسن نے اپنے یوم مرگ کی یاددہانی کے طور پر سفید عبا پہنی اور رسم کے مطابق ربی کے گرد سات چکر لگائے۔ گندھی ہوئی موم بتّیوں کی روشنی میں دیواروں پر سائے ڈول رہے تھے۔ ایک صراحی میں شراب انڈیلنے کے بعد ربی اداس دھن میں دعائیں گنگنانے لگا۔ دوبی کے منھ سے محض ایک چیخ سی نکلی۔ رہیں دوسری عورتیں، تو انھوں نے اپنے گوٹے والے رومال نکالے اور انھیں ہاتھوں میں لیے کھڑی منھ بناتی رہیں۔ جب نانبائی کے شاگرد سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے مذاق کرنے لگے تو ربی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بڑبڑایا جو اس امر کی علامت تھی کہ بولنا منع ہے۔ دلھن کو انگوٹھی پہنانے کا موقع آیا تو

دولھا کا ہاتھ کانپنے لگا اور اسے دوبی کی درمیانی انگلی ڈھونڈنے میں دشواری ہوئی۔ رواج کے مطابق اگلا مرحلہ شیشے کی صراحی توڑنے کا تھا، لیکن ڈاکٹر فشلسن کی متعدّد ٹھوکروں کے باوجود صراحی ثابت و سالم رہی۔ لڑکیوں نے سر جھکا لیے اور محظوظ ہو کر منھ ہی منھ میں ہنستے ہوے ایک دوسرے کو چٹکیاں بھرنے لگیں۔ آخرکار ایک شاگرد نے صراحی پر اپنی ایڑی ماری اور وہ چکناچور ہو گئی۔ ربی بھی اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکا۔ تقریب کے بعد مہمانوں نے ووڈکا پی اور بسکٹ کھائے۔ دوبی کا سابقہ مالک ڈاکٹر فشلسن کے پاس آیا اور کہنے لگا، "مبارک ہو، دولھا میاں! تمھاری قسمت بھی تمھاری بیوی جیسی اچھی ہو۔" "شکریہ! شکریہ!" ڈاکٹر فشلسن بڑبڑایا۔ "لیکن مجھے کسی خوش بختی کی امید نہیں ہے۔" اسے جلدازجلد اپنی دوچھتّی میں لوٹ جانے کی فکر تھی کیوں‌کہ اسے اپنے پیٹ میں دباؤ اور سینے میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت سبز سی ہو گئی تھی۔ دوبی اچانک بگڑ اٹھی۔ اس نے نقاب اٹھائی اور ہجوم سے مخاطب ہو کر کہا، "تم لوگ کس بات پر ہنس رہے ہو؟ یہاں کوئی تماشا ہو رہا ہے؟" اور گدّے کا غلاف اٹھائے بغیر جس میں تحفے بھرے ہوے تھے، وہ اپنے شوہر کے ساتھ پانچویں منزل پر اپنے کمروں میں لوٹ آئی۔

اپنے کمرے میں تازہ بچھے ہوے بستر پر لیٹ کر ڈاکٹر فشلسن نے "اخلاقیات" کا مطالعہ شروع کر دیا۔ دوبی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ بوڑھا آدمی ہے، بیمار ہے اور اس میں طاقت نہیں ہے۔ اس نے دوبی سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ تاہم وہ شب خوابی کا ریشمی لباس پہنے، پاؤں میں گھنڈیوں والے سلیپر ڈالے اور شانوں پر بال بکھرائے لوٹ آئی۔ اس کے چہرے پر تبسّم تھا اور وہ شرمیلی اور متذبذب لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر فشلسن کانپ اٹھا اور اس کے ہاتھ سے "اخلاقیات" گر پڑی۔ موم بتّی گل ہو گئی۔ دوبی نے اندھیرے میں ڈاکٹر فشلسن کو ٹٹولا اور اس کا منھ چوم لیا۔ "میرے پیارے شوہر!" اس نے سرگوشی کی۔ "مبارک ہو!"

اس رات جو کچھ پیش آیا اسے معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر ڈاکٹر فشلسن اس بات کا قائل نہ ہوتا کہ ہر وقوعہ قوانینِ فطرت کے مطابق ہوتا ہے تو وہ سوچتا کہ دوبی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ اس کے اندر مدتوں کی سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھیں۔ گو اس نے مقدّس شراب کی صرف ایک ہی

چسکی لی تھی لیکن وہ خود کو نشے میں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے دوبی کو چوما اور اس سے پیار کی باتیں کیں۔ کلاپ اسٹاک، لیسنگ اور گوئٹے کے کب کے بھولے ہوئے اقتباس اس کے ہونٹوں پر آ گئے۔ دباؤ اور درد تھم گئے۔ اس نے دوبی کو ہم آغوش کیا، اپنے ساتھ لپٹایا اور دوبارہ ویسا ہی ہو گیا جیسا اپنی جوانی میں تھا۔ دوبی پر مسرّت سے غشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ چلّا رہی تھی اور وارسا کی عامیانہ زبان میں ایسی باتیں کہہ رہی تھی جنھیں وہ نہیں سمجھتا تھا۔ بعدازاں ڈاکٹر ایسی گہری نیند میں ڈوب گیا جس سے صرف نوجوان ہی آشنا ہوتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ وہ سوئٹزرلینڈ میں ہے اور دوڑتے، اڑتے اور گرتے ہوئے، پہاڑوں پر چڑھ رہا ہے۔ پو پھٹے اس کی آنکھ کھلی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ کسی نے اس کے کان میں پھونک ماری ہے۔ دوبی خرّاٹے لے رہی تھی۔ ڈاکٹر فِشلسن خاموشی کے ساتھ بستر سے نکلا۔ شب خوابی کی لمبی قمیص میں وہ دریچے تک گیا، سیڑھیاں طے کیں اور حیرت سے باہر جھانکا۔ گہرے سکوت میں سانس لیتی ہوئی مارکیٹ اسٹریٹ سو رہی تھی۔ گیس کے لیمپ ٹمٹما رہے تھے۔ دُکانوں کے سیاہ کِواڑ لوہے کی سلاخوں سے بند تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ڈاکٹر فِشلسن نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ سیاہ محراب ستاروں سے چھلک رہی تھی۔ ان میں سبز، سرخ، زرد اور نیلے ستارے بھی تھے۔ ان میں چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی، ٹمٹماتے ہوئے بھی اور درخشاں بھی۔ ایسے بھی تھے جو گھنے جُھرمٹوں میں جمع تھے اور ایسے بھی جو تنہا تھے۔ عالمِ بالا میں اس حقیقت پر بظاہر کم ہی توجّہ دی گئی تھی کہ کسی ڈاکٹر فِشلسن نے، اپنے زوال کے ایّام میں، بلیک دوبی نامی عورت سے شادی کر لی ہے۔ وہاں، اوپر سے، دیکھنے پر جنگِ عظیم بھی تغیرات کے ایک وقتی کھیل کے سوا کچھ نہ تھی۔ غیرمتحرک ستاروں کے انبوہ لامتناہی خلا میں اپنے معیّنہ راستوں پر محوِسفر تھے۔ دُم دار ستارے، سیّارے، ذیلی سیّارے ان چمک دار ستارہ نما محوروں کے طواف میں مشغول تھے۔ کائناتی تغیرات میں دنیائیں پیدا اور نابود ہو رہی تھیں۔ سحابیوں کے انتشار میں قدیمی مادّہ تشکیل پا رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی ستارہ ٹوٹتا اور ایک شعلہ فشاں لکیر چھوڑتا ہوا تیزی سےآسمان کو پار کر جاتا۔ یہ اگست کا مہینا تھا، جب ٹوٹتے ستاروں کی بوچھاریں ہوتی ہیں۔ ہاں، الوہی ذات بےپایاں تھی، اس کا آغاز تھا نہ انجام۔ وہ کسی زمانی تعیّن سے ماورا، مطلق، غیرمنقسم اور ابدی تھی، اور اپنی

صفات میں لامتناہی۔ علّت و معلول کے اس متواتر سلسلے کے مطابق اس کی لہریں اور بلبلے تبدیلیوں سے ابلتے ہوئے آفاقی کڑھاؤ میں رقصاں تھے۔ اور وہ، ڈاکٹر فِشلسن، اپنے ناگزیر مقدّر کے ساتھ، اس کا حصّہ تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی پلکیں موند لیں اور ٹھنڈی ہوا کو اپنی پیشانی کا پسینا سکھانے اور داڑھی کے بالوں سے کھیلنے دیا۔ اس نے نیم شب کی ہوا میں گہرا سانس لیا اور اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دریچے کی چوکھٹ کا سہارا لیتے ہوئے بولا، "مقدّس اِسپینوزا، مجھے معاف کر دو! میں بےوقوف بن گیا ہوں۔"

آئزک باشیوس سنگر

انگریزی سے ترجمہ : راشد مفتی

کیفے ٹیریا

۱

حالاں کہ اب میں اس منزل پر پہنچ چکا ہوں کہ میری آمدنی کا ایک بڑا حصّہ ٹیکسوں کی نذر ہو جاتا ہے، لیکن اوقاتِ فراغت میں کیفے ٹیریا میں کھانا کھانے کی عادت برقرار ہے۔ ہاتھوں میں ٹرے اٹھا کر، جس میں چُھری، کانٹا، چمچا اور کاغذی رومال چُنے ہوے ہوں، مجھے کاؤنٹر پر سے اپنی پسند کے کھانے منتخب کرنے کا شوق ہے۔ پھر وہاں پولینڈ سے آئے ہوے ہم وطن بھی مل جاتے ہیں اور ہر قسم کے ادبی مبتدیوں کے علاوہ یِدِش جاننے والے قارئین بھی۔ جوں ہی میں کھانا لے کر بیٹھتا ہوں، وہ میرے پاس آ جاتے ہیں۔ "ہیلو، آروِن!" وہ میرا سواگت کرتے ہیں، اور پھر ہم یِدِش ادب، ہولوکاسٹ، مملکتِ اسرائیل اور اُن شناساؤں کی باتیں کرنے لگتے ہیں جنھیں پچھلی بار میں نے چاولوں کی پڈنگ یا دم پُخت آلوبخارے کھاتے دیکھا تھا اور جو اَب اپنی قبروں میں پہنچ چکے ہیں۔ چوں کہ میں اخبار شاذ ہی پڑھتا ہوں لہٰذا ایسی خبریں مجھ تک دیر ہی سے پہنچتی ہیں۔ میں بھونچکّا رہ جاتا ہوں، لیکن میری عمر میں آدمی کو ایسی اطلاعات کے لیے تیّار رہنا ہی پڑتا ہے۔ کھانا میرے گلے میں اٹک جاتا ہے، ہم سب پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور ہماری نظریں سوال کرتی ہیں: اگلی باری کس کی ہے؟ جلد ہی ہم پھر نوالے چبانا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے اکثر افریقا سے متعلّق ایک فلم کا منظر یاد آ جاتا ہے۔ شیر زیبروں کے ریوڑ پر حملہ کر کے ایک زیبرے کو گرا لیتا ہے۔ خوف زدہ زیبرے تھوڑی دور تک بھاگتے ہیں اور پھر ٹھہر کر دوبارہ چرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس اَور کون سا راستا

ہے؟

یدش کے ان شیدائیوں کو مَیں بہت زیادہ وقت نہیں دے سکتا کہ ہمیشہ مصروف رہتا ہوں۔ میں کسی نہ کسی ناول یا کہانی یا مضمون پر کام کر رہا ہوتا ہوں۔ مجھے آج یا کل کہیں نہ کہیں لیکچر دینا ہوتا ہے۔ میری ڈائری ہفتوں بلکہ مہینوں کی پیشگی مصروفیتوں سے بھری رہتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ یہاں سے اٹھنے کے ایک گھنٹے بعد مَیں شکاگو جانے والی ٹرین میں سوار ہوں یا کیلی فورنیا کی سمت محوِپرواز ہوں۔ لیکن جتنی دیر یہاں ہوتا ہوں، ہم لوگ اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور میں ایسی ایسی سازشوں اور کمینگیوں کا ذکر سنتا ہوں جن سے، اخلاقی نقطۂ نظر سے، لاعلم رہنا ہی اچھا۔ ہر شخص اپنے انداز میں، اپنے وسائل کی مدد سے، زیادہ سے زیادہ عزّت، دولت اور وقار بٹورنے کی کوشش میں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی ان ساری مَوتوں سے کچھ نہیں سیکھتا۔ بڑھاپا ہماری تطہیرِنفس نہیں کرتا۔ ہم درِجہنّم پر بھی پشیمانی سے دور رہتے ہیں۔

اِس نواح میں گھومتے پھرتے مجھے تیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ یہ اُس مدّت کے برابر ہے جو میں نے پولینڈ میں گزاری۔ میں یہاں کی ہر گلی اور ہر مکان سے واقف ہوں۔ گزشتہ عشروں کے دوران میں براڈوے کے اِس حصّے پر بہت کم تعمیرات ہوئی ہیں اور مجھے یہ وہم ہو چلا ہے کہ میری جڑیں یہیں ہیں۔ میں یہاں کے زیادہ تر معبدوں میں تقریریں کر چکا ہوں۔ کچھ دُکانوں اور ویجی ٹیرین ریستورانوں میں پہچانا جاتا ہوں۔ جن عورتوں سے میرے سلسلے رہے ہیں، پہلو کی گلیوں میں رہتی ہیں۔ کبوتر بھی مجھے جانتے ہیں؛ جیسے ہی میں دانے کا تھیلا لیے ہوے آتا ہوں، وہ دور سے اڑ کر میرے پاس آ جاتے ہیں۔ یہ علاقہ نائنٹی سِکستھ اسٹریٹ سے سیونٹی سیکنڈ اسٹریٹ تک، اور سینٹرل پارک سے رِیورسائیڈ ڈرائیو تک پھیلا ہوا ہے۔ تقریباً روزانہ ہی لنچ کے بعد چہل قدمی کرتے ہوے میں تدفین گاہ کے پاس سے گزرتا ہوں جو ہماری، اور ہماری تمام خواہشوں اور فریب خیالیوں کی، منتظر ہے۔ بسااوقات میں خیال کرتا ہوں کہ تدفین گاہ بھی ایک طرح کا کیفےٹیریا ہے جہاں ایک عاجِلانہ مدح یا ماتمی دعا کے بعد آدمی ابدیت کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔

کیفےٹیریا میں مَیں جن لوگوں سے ملتا ہوں اُن میں زیادہ تر مرد ہیں: مجھ جیسے بوڑھے کنوارے، مستقبل کے ادیب، ریٹائرڈ استاد، کچھ مشکوک

سندوں والے ڈاکٹر، مقتدیوں سے محروم ایک ربی، صہیونی موضوعات پر تصویریں بنانے والا ایک مصوّر، چند مترجم۔ یہ سب کے سب پولینڈ یا روس کے تارکینِ وطن ہیں۔ میں ان کے ناموں سے شاذ ہی واقف ہوتا ہوں۔ ان میں سے کوئی اچانک غائب ہو جاتا ہے، اور میں سوچتا ہوں کہ وہ عدم آباد پہنچ چکا ہے تو وہ یکایک نمودار ہو جاتا ہے اور مجھے بتاتا ہے کہ اس نے تل ابیب یا لاس اینجلز میں آباد ہونے کی کوشش کی۔ وہ دوبارہ اپنی چاول کی پڈنگ کھانے لگتا ہے اور اپنی کافی کو سیکرین سے میٹھا کرتا ہے۔ اُس کے چہرے پر نئی جھرّیوں کا اضافہ ہو گیا ہوتا ہے لیکن وہ مجھے وہی پُرانی کہانیوں سناتا ہے اور اُسی طرح ہاتھ ہلاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جیب سے ایک کاغذ نکال کر مجھے اپنی تازہ نظم سنانے لگے۔

یہ سن پچاس کی دہائی کی بات ہے کہ اس حلقے میں ایک عورت نمودار ہوئی تھی۔ وہ ہم سب کی نسبت کم عمر نظر آتی تھی۔ اُس کی عمر تیس برس سے کچھ ہی زیادہ رہی ہو گی۔ وہ پستہ قد اور دبلی پتلی تھی۔ اس کا چہرہ لڑکیوں کا سا اور بال بُھورے تھے جنھیں وہ جُوڑے کی شکل میں گوندھتی تھی۔ اس کی ناک چھوٹی تھی اور رخساروں میں گڑھے تھے۔ آنکھیں بادامی تھیں، بلکہ سچ پوچھو تو ان کا رنگ غیرحتمی سا تھا۔ وہ یوروپی وضع کا سادہ لباس پہنتی تھی۔ پولِش، روسی اور بامحاورہ یِدِش بولتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ یِدِش اخبار اور رسالے ہوا کرتے۔ وہ روس میں قیدیوں کے ایک کیمپ میں رہ چکی تھی اور ریاست ہائے متّحدہ کا ویزا ملنے سے پہلے جرمنی کے کیمپوں میں بھی کچھ وقت گزار چکی تھی۔ سارے مرد اُس کے گرد منڈلایا کرتے تھے۔ وہ اسے بِل ادا نہیں کرنے دیتے تھے اور عاشقانہ انداز سے کافی اور پنیر کے کیک لا لا کر پیش کیا کرتے تھے۔ وہ اس کی باتیں اور لطیفے سنتے رہتے تھے۔ وہ تباہی سے نکل کر آنے کے باوجود بےحد زندہ دل تھی۔ مجھ سے بھی اس کا تعارف کرایا گیا۔ اس کا نام ایستھر تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ غیرشادی شدہ ہے یا بیوہ یا مطلقہ۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک فیکٹری میں بٹن چھانٹنے کا کام کرتی ہے۔ گزری زندگیوں والے معمّر لوگوں کا یہ حلقہ اس تروتازہ نوجوان عورت کے لیے بےمحل سا تھا۔ یہ بھی سمجھنا دشوار تھا کہ اسے نیوجرزی میں بٹن چھانٹنے سے بہتر کوئی کام کیوں نہیں مل سکا۔ مگر میں زیادہ سوال نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے پولینڈ میں بھی میری تحریریں پڑھی تھیں اور بعدازاں، جنگ کے

اختتام پر، جرمنی کے کیمپوں میں بھی۔ اس نے مجھ سے کہا، "میرے ادیب آپ ہیں۔"

جوں‌ہی اس نے یہ الفاظ ادا کیے، میں نے قیاس کیا کہ مجھے اس سے محبّت ہو گئی ہے۔ ہم تنہا بیٹھے تھے (ہماری میز کا دوسرا شریک ٹیلی فون کرنے گیا ہوا تھا)۔ سو میں نے کہا، "ان الفاظ کے بدلے تو مجھے تم کو چوم لینا چاہیے۔"

"اچھا، تو پھر انتظار کس بات کا ہے؟"

اس نے مجھے بوسہ بھی دیا اور کاٹ بھی لیا۔

میں نے کہا، "تم سراپا آگ ہو۔"

"ہاں، لیکن جہنّم کی۔"

چند دن بعد اس نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا۔ وہ براڈوے اور ریورسائیڈ کے درمیان واقع ایک گلی میں اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی جو ٹانگوں سے معذور تھا اور سارا دن وِیل چیئر پر بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی ٹانگیں سائبیریا میں سردی سے منجمد ہو گئی تھیں۔ ۱۹۴۴ کی سرما میں اس نے اسٹالِن کے ایک بیگار کیمپ سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ دیکھنے میں وہ طاقت ور لگتا تھا۔ اس کے بال گھنے اور سفید تھے؛ چہرہ سرخ اور آنکھیں توانائی سے بھرپور تھیں۔ وہ تحکّمانہ لہجے میں بولتا تھا۔ اس کی باتوں میں لڑکوں کی سی شیخی خوری تھی اور قہقہوں میں زندہ دلی۔ گھنٹےبھر میں اس نے مجھے اپنی کہانی سنا ڈالی۔ وہ پیدا تو وائٹ رشیا میں ہوا تھا لیکن وارسا، لوڈز اور وِلنا میں برسوں گزار چکا تھا۔ وہ سن تیس کی دہائی کے شروع میں کمیونسٹ ہو گیا تھا اور اس کے بعد جلد ہی پارٹی کا کارکن بھی۔ ۱۹۳۹ میں وہ اپنی بیٹی کو لے کر روس فرار ہو گیا، لیکن اس کی بیوی اور دوسرے بچے وارسا ہی میں رہے جہاں ناتسیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ روس میں کسی نے اس پر تراتسکی کا پیرو ہونے کا الزام لگا دیا اور اسے شمال میں سونے کی کانوں میں بھیج دیا گیا۔ پارٹی وہاں لوگوں کو مرنے کے لیے بھیجتی تھی۔ طاقت ور سے طاقت ور شخص بھی وہاں سردی اور بھوک سے سال بھر سے پہلے مر جاتا تھا۔ لوگوں کو سزا سنائے بغیر وہاں بھیجا جاتا تھا۔ وہ وہاں اکٹھے مرتے تھے۔ صہیونی، پولِش سوشلسٹ پارٹی کے رکن، یوکرین کے قوم پرست اور محض پناہ گزیں جو فقط مزدوروں کی قلّت کے باعث پکڑے جاتے تھے۔ غرض کہ کوئی بھی محفوظ

نہ تھا۔ اکثر لوگ اسکروی اور بیری بیری کی بیماریوں سے مرتے تھے۔ ایستھر کا باپ، جس کا نام بورِس میرکن تھا، یہ قصّہ یوں بیان کر رہا تھا گویا کوئی مزےدار لطیفہ سنا رہا ہو۔ وہ اسٹالن کے پیروؤں کا ذکر اچھوت، ڈاکو اور ٹوڈی جیسے ناموں سے کرتا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ اگر امریکا مداخلت نہ کرتا تو ہٹلر سارے روس کو زیر کر لیتا۔ اس نے بتایا کہ روٹی کا فاضل ٹکڑا یا پانی جیسے شوربے کا دُگنا حصّہ حاصل کرنے کے لیے قیدی سپاہیوں کو کیسے جُل دیتے تھے اور یہ کہ جوئیں نکالنے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔

ایستھر بول اٹھی، "ابّا، بس۔"

"کیا ہوا؟ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"سچ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"بیٹی، یہ تمھارا ہی کیا دھرا ہے۔"

ایستھر باورچی خانے میں چائے بنانے گئی تو مجھے اس کے باپ سے معلوم ہوا کہ روس میں کبھی اس کا شوہر بھی تھا۔ وہ پولینڈ کا یہودی تھا اور سرخ فوج میں رضاکارانہ بھرتی ہوا تھا لیکن جنگ میں مارا گیا۔ یہاں نیویارک میں ایستھر کا سلسلہ ایک پناہ گزیں سے چل رہا تھا جو جرمنی کا ایک سابق اسمگلر تھا لیکن اب جِلدسازی کی ایک فیکٹری کھول کر مال دار ہو گیا تھا۔ "ایستھر کو اس سے شادی پر آمادہ کرو۔" بورِس میرکن نے مجھ سے کہا۔ "یہ میرے لیے بھی اچھا ہو گا۔"

"ہو سکتا ہے ایستھر اس سے محبّت نہ کرتی ہو۔"

"محبّت جیسی کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ مجھے ایک سگریٹ دینا۔ کیمپ میں لوگ کیڑوں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھتے تھے۔"

۲

میں نے ایستھر کو کھانے پر بلایا تھا لیکن اس نے فون کر کے بتایا کہ اسے بخار ہو گیا ہے اور بستر سے ہلنے تک کی اجازت نہیں ہے۔ پھر کچھ دن بعد ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی کہ مجھے بیرونِ ملک جانا پڑا۔ واپسی میں مَیں نے لندن اور پیرس میں قیام کیا۔ میں ایستھر کو خط لکھنا چاہتا تھا لیکن اس کا پتا مجھ سے کھو گیا تھا۔ نیویارک پہنچ کر میں نے اس سے

رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر ٹیلی فون کی کتاب میں بورس میرکِن کا نام تھا نہ ایستھر میرکِن کا۔ باپ بیٹی یقیناً کسی اَور کے گھر میں کرائےدار کی حیثیت سے رہتے ہوں گے۔ ہفتوں گزر گئے لیکن وہ کیفےٹیریا میں نہ آئی۔ میں نے اپنے حلقے کے لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا۔ کسی کو اس کے ٹھکانے کی خبر نہ تھی۔ "غالباً اس نے اُسی جِلدساز سے شادی کر لی،" میں نے اپنےآپ کو سمجھایا۔ ایک شام میں اس احساس کے ساتھ کیفےٹیریا گیا کہ آج اس سے ملاقات ہو گی۔ مجھے ایک سیاہ دیوار اور تختہ بند کھڑکیاں نظر آئیں -- کیفےٹیریا جل چکا تھا۔ بوڑھے کنواروں نے بلاشبہ کوئی اَور کیفےٹیریا یا آٹومَیٹ آباد کر لیا ہو گا۔ لیکن کہاں؟ ڈھونڈنا میری فطرت میں نہیں ہے۔ ایستھر کے بغیر بھی میری زندگی خاصی پیچیدہ تھی۔

گرمیاں گزر گئیں اور اب جاڑوں کے دن تھے۔ ایک روز، شام ڈھلے، میں کیفےٹیریا کے پاس سے گزرا تو میں نے وہاں لوگوں کی آمدورفت دیکھی۔ مالکوں نے اسے دوبارہ تعمیر کر لیا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو ایستھر ایک میز پر اکیلی بیٹھی دکھائی دی۔ وہ ایک پِدِش اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی اور میں کچھ دیر یوں‌ہی اسے دیکھتا رہا۔ اس نے فَر والی مردانہ ٹوپی اور فَر ہی کے کالر والی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ زرد سی دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی بیماری سے اٹھ رہی ہو۔ کیا اس کا وہ بخار کسی تشویش ناک علالت کا آغاز تھا؟ میں اس کی میز پر گیا اور کہا، "بٹنوں کی کیا خبر ہے؟"

وہ چونک پڑی اور مسکرانے لگی۔ پھر بولی، "معجزے واقعی رونما ہوتے ہیں۔"

"کہاں رہیں؟"

"آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟" اس نے جواب دیا۔ "میرا خیال تھا آپ ابھی تک ملک سے باہر ہیں۔"

"ہمارے کیفےٹیریائی کہاں ہیں؟"

"وہ اب ففٹی سیونتھ اسٹریٹ اور ایٹتھ ایوینیو پر واقع کیفےٹیریا میں بیٹھتے ہیں۔ یہ کیفےٹیریا تو کل ہی دوبارہ کھلا ہے۔"

"تمھارے لیے کافی لاؤں؟"

"میں بہت زیادہ کافی پینے لگی ہوں۔ خیر۔"

میں اس کے لیے کافی اور انڈوں کا بڑا سا کیک لینے گیا۔ کاؤنٹر پر

کھڑے کھڑے میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی مردانہ ٹوپی اتار کر بال درست کر لیے تھے؛ اخبار تہہ کر لیا تھا، جس کا مطلب تھ کہ اب وہ گفتگو کے لیے تیار ہے۔ وہ کھڑی ہوئی اور دوسری کرسی کو، اس علامت کے طور پر کہ یہاں کوئی بیٹھا ہے، جُھکا کر میز پر ٹکا دیا۔ میں بیٹھ چکا تو وہ بولی، "آپ الوداع کہے بغیر ہی چلے گئے۔ میں تو آسمان کے دروازے پر دستک دیتے دیتے رہ گئی۔"

"کیا ہوا تھا؟"

"بخار نے نمونیا کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے پینسلین دی جس کا رِی ایکشن ہو گیا اور میرے تمام بدن پر دانے نکل آئے۔ ابّا کی طبیعت الگ خراب ہے۔"

"انھیں کیا شکایت ہے؟"

"ہائی بلڈپریشر۔ انھیں کسی قسم کا دورہ پڑا تھا جس سے ان کا منھ ٹیڑھا ہو گیا ہے۔"

اوہ! بڑا افسوس ہوا۔ کیا تم اب بھی بٹنوں کا کام کرتی ہو؟"

"ہاں۔ اس میں مجھے کم از کم اپنا سر نہیں استعمال کرنا پڑتا، ہاتھوں ہی سے کام چل جاتا ہے، اور میں اپنی سوچوں میں مگن رہ سکتی ہوں۔"

"کیا سوچتی رہتی ہو؟"

"کیا نہیں سوچتی؟ وہاں کام کرنے والے دوسرے تمام لوگ پوٹوریکو کے ہیں۔ وہ صبح سے شام تک ہسپانوی میں بڑبڑ کرتے رہتے ہیں۔"

"تمھارے ابّا کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔ میں شام کو واپس آ کر کھانا پکاتی ہوں۔ ان کی ایک ہی تمنّا ہے، کہ میری شادی کر دیں۔ میری اپنی بھلائی اور غالباً اپنے آرام کے لیے۔ مگر میں ایسے کسی شخص سے شادی نہیں کر سکتی جس سے مجھے محبّت نہ ہو۔"

"محبّت کیا ہوتی ہے؟"

"یہ آپ پوچھ رہے ہیں؟ آپ تو محبّت کے بارے میں ناول لکھتے ہیں۔ لیکن آپ مرد ہیں۔ میرا خیال ہے آپ محبّت کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے۔ عورت آپ کے لیے ایک جنسِ تجارت ہے۔ مجھے لغو باتیں کرنے والے اور احمقوں کی طرح مسکرانے والے مردوں سے گھِن آتی ہے۔ میں ایسے کسی مرد کے ساتھ رہنے کے بجائے مر جانا پسند کروں گی۔ اور وہ مرد بھی میرے

لیے نہیں ہے جو ایک کے بعد دوسری عورت کے پاس جاتا ہو۔ میں کسی کے ساتھ شراکت نہیں کر سکتی۔"

"مجھے ڈر ہے کہ ایسا وقت آ رہا ہے جب سب کو یہی کرنا پڑے گا۔"

"کم از کم مَیں ایسا نہیں کروں گی۔"

"تمھارا شوہر کس طرح کا آدمی تھا؟"

"آپ کو میرے شوہر کا کیسے پتا چلا؟ شاید ابّا نے بتایا ہو گا۔ ادھر میں کمرے سے نکلی اور اُدھر انھوں نے بچّوں کی سی باتیں کرنا شروع کیں۔ میرا شوہر آدرشوں میں یقین رکھتا تھا اور ان کے لیے مرنے کو تیار تھا۔ وہ مکمّل طور پر میری قِسم کا نہیں تھا مگر میں اس کی عزّت کرتی تھی اور مجھے اس سے محبّت بھی تھی۔ وہ مرنا چاہتا تھا اور اس نے بہادروں کی طرح جان دی۔ اس کے علاوہ اَور کیا کہہ سکتی ہوں؟"

"اور دوسرے؟"

"دوسرے اَور کوئی نہیں تھے۔ مرد میرے پیچھے لگے رہتے تھے۔ جنگ کے دنوں میں لوگوں کا جو رویّہ تھا آپ کبھی نہیں جان سکیں گے۔ ان کی شرم مر چکی تھی۔ ایک بار میرے قریب کے دیواری بستروں پر ماں ایک مرد کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اور اس کی بیٹی دوسرے کے ساتھ۔ لوگ درندے بن گئے تھے، بلکہ ان سے بھی بدتر۔ اور میں اُس ماحول میں محبّت کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ اب تو میں نے خواب دیکھنے بھی چھوڑ دیے ہیں۔ یہاں جو لوگ آتے ہیں سب کے سب پرلے درجے کے بور ہیں۔ اکثر تو نیم پاگل ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے چالیس صفحے کی نظم سنانے کی کوشش کی تھی۔ میں تقریباً بےہوش ہو گئی تھی۔"

"میں اپنی لکھی ہوئی کوئی چیز تمھیں کبھی نہیں سناؤں گا۔"

"میں نے آپ کے رویّے کے بارے میں سن رکھا ہے -- نہیں۔"

"اور نہیں کا مطلب ہے نہیں۔ اپنی کافی ختم کرو۔"

"آپ تو مجھے قائل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ یہاں اکثر لوگ ناک میں دَم کر دینے والے ہیں اور ان سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔ روس میں لوگ دُکھی تھے، لیکن وہاں میں نے اتنے جنونی نہیں دیکھے جتنے یہاں نیویارک میں ہیں۔ میں جس عمارت میں رہتی ہوں وہ ایک پاگل خانہ ہے۔ میرے پڑوسی خبطی ہیں۔ وہ ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں، گاتے ہیں، چلّاتے ہیں، برتن توڑتے ہیں۔ ایک عورت نے تو کھڑکی سے کود کر

جان دے دی۔ اس کا ایک لڑکے سے معاشقہ چل رہا تھا جو عمر میں اس سے بیس سال چھوٹا تھا۔ روس میں جوؤں سے بچنے کا مسئلہ تھا، لیکن یہاں تو ہم پاگلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔"

ہم نے کافی ختم کی اور انڈے کا کیک مل کر کھایا۔ ایستھر نے اپنی پیالی نیچے رکھی۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ میں آپ کے ساتھ بیٹھی ہوں۔ میں آپ کی ساری چیزیں، جو آپ مختلف قلمی ناموں سے لکھتے ہیں، سب پڑھتی ہوں۔ اپنے بارے میں آپ اتنا زیادہ بتاتے ہیں کہ مجھے یہ احساس ہوتا ہے میں آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ اس کے باوجود آپ میرے لیے ایک پہیلی ہیں۔"

"مرد اور عورت ایک دوسرے کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔"

"واقعی۔ میں تو اپنے ابّا کو بھی نہیں سمجھ سکی۔ بعض اوقات وہ بالکل اجنبی ہو جاتے ہیں۔ وہ زیادہ عرصے نہیں جییں گے۔"

"اتنے بیمار ہیں؟"

"اصل میں بہت ساری باتوں کا اثر ہے ان پر۔ وہ جینے کی اُمنگ کھو بیٹھے ہیں۔ آخر ٹانگوں کے بغیر، دوستوں کے بغیر، خاندان کے بغیر کیوں جییں؟ سب لوگ مر چکے ہیں۔ وہ سارا دن بیٹھے اخبار پڑھا کرتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ انھیں کاروبارِدنیا سے دلچسپی ہے۔ اُن کے آدرش مٹ چکے ہیں، لیکن انھیں اب بھی ایک منصفانہ انقلاب کی امید ہے۔ انقلاب ان کی کیا مدد کر سکتا ہے؟ میں نے خود کبھی کسی پارٹی یا تحریک سے امّید وابستہ نہیں کی۔ جب ہر چیز کا انجام موت ہے تو ہم کیسے امید کر سکتے ہیں؟"

"امّید بجائےخود اس بات کا ثبوت ہے کہ موت کی کوئی حقیقت نہیں۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں۔ آپ اس موضوع پر اکثر لکھتے ہیں۔ میرے لیے تو موت ہی واحد تسکین ہے۔ مُردے کیا کیا کرتے ہیں؟ کیا وہ کافی کے ساتھ انڈے کا کیک کھاتے ہیں؟ اخبار پڑھتے ہیں؟ موت کے بعد کی زندگی مذاق کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

۳

کچھ کیفےٹیریائی دوبارہ تعمیرشدہ کیفےٹیریا میں لوٹ آئے۔ نئے لوگ بھی آنے لگے، جو سب کے سب یوروپی تھے۔ وہ یِدِش، پولِش، روسی، یہاں تک کہ عبرانی زبان میں طویل بحثیں کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ جو ہنگری کے

تھے، جرمن، ہنگیرین اور یِدِش جرمن کو خلط ملط کر دیتے تھے، اور پھر یکایک عام فہم گالیشین یِدِش بولنے لگتے تھے۔ وہ اپنی کافی گلاسوں میں منگواتے اور کافی پیتے وقت شکر کے ٹکڑے دانتوں کے درمیان لیے رہتے تھے۔ ان میں سے بیشتر میرے قارئین تھے۔ وہ اپنا تعارف کراتے اور میری ہر طرح کی ادبی غلطیوں پر مجھے ملامت کرتے؛ یعنی یہ کہ میں اپنی ہی بات کی تردید کرنے لگتا ہوں؛ جنس کے بیان میں بہت آگے نکل جاتا ہوں؛ یہودیوں کا ذکر اس انداز سے کرتا ہوں جسے یہوددشمن پروپیگنڈے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ مجھے یہودبستیوں، ناتسی کیمپوں اور روس میں اپنے تجربات سے آگاہ کرتے اور ایک دوسرے کی عیب جوئی کرتے۔ "اُس شخص کو دیکھ رہے ہیں آپ؟ وہ روس میں فوراً اسٹالِنی بن گیا تھا۔ اس نے اپنے ہی دوستوں کو پکڑوایا۔ اور اب یہاں امریکا میں کمیونسٹ دشمن بن گیا ہے۔" جس شخص کے متعلّق بات ہو رہی ہوتی وہ فوراً سمجھ جاتا کہ اس پر کیچڑ اُچھالی جا رہی ہے، کیوں‌کہ جوں‌ہی میرا مخبر رخصت ہوتا وہ اپنی کافی کی پیالی اور چاول کی پڈِنگ لے کر میری میز پر آ جاتا اور یوں گویا ہوتا: "آپ کو جو کچھ بتایا گیا ہے اس کے ایک لفظ پر بھی یقین مت کیجیے۔ یہ لوگ ہر طرح کے جھوٹ گھڑ لیتے ہیں۔ ایسے ملک میں جہاں ہر وقت پھندا گلے میں تھا، آپ کیا کر سکتے تھے؟ اگر آپ قزاخستان میں کسی جگہ مرنا نہیں چاہتے تھے تو آپ کو نبھانا ہی پڑتا تھا۔ شوربے کا ایک پیالا یا سر چھپانے کی جگہ حاصل کرنے کے لیے اپنی روح کو بیچنا پڑتا تھا۔"

تارکینِ وطن کا ایک دھڑا ایسا تھا جو مجھے نظرانداز کیا کرتا تھا۔ یہ لوگ ادب اور صحافت سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ انھیں صرف اپنے کاروبار سے غرض تھی۔ یہ لوگ جب جرمنی میں تھے تو اسمگلر تھے، اور یہاں بھی کسی خفیہ کاروبار میں مصروف نظر آتے تھے۔ یہ آپس میں کاناپھوسی کرتے اور ایک دوسرے کو آنکھ مارتے تھے۔ وہ اپنی رقمیں گنتے اور اعداد کی لمبی لمبی فہرستیں لکھتے رہتے۔ کسی نے ان میں سے ایک کے بارے میں بتایا، "آؤشوِتز میں اس کا اسٹور تھا۔"

"کیا مطلب -- اسٹور؟"

"خدا ہمارا نگہبان ہو۔ یہ بھوسے کے جس ڈھیر میں سوتا تھا اُسی میں اپنی اجناسِ تجارت رکھتا تھا۔ یعنی ایک آدھ سڑا ہوا آلو، دو چار صابن کے ٹکڑے، ٹین کے چمچے اور تھوڑی بہت چربی۔ اس کے باوجود اس کا کاروبار

چلتا تھا۔ بعد میں وہ جرمنی میں اتنا بڑا اسمگلر بن گیا کہ ایک بار حکومت نے اس کے چالیس ہزار ڈالر ضبط کیے۔"

بعض اوقات مہینوں میرا کیفےٹیریا جانا نہ ہوتا۔ ایستھر کو وہاں دیکھے ہوے ایک یا دو سال گزر چکے تھے (یا شاید تین چار سال، میں گنتی بھول گیا تھا)۔ چند بار مَیں نے اس کے بارے میں پوچھا بھی۔ کسی نے بتایا کہ وہ فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ والے کیفےٹیریا میں جانے لگی ہے۔ ایک اَور شخص نے سنا تھا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ کئی کیفےٹیریائی خدا کو پیارے ہو گئے ہیں۔ وہ ریاست ہائے متحدہ میں آباد ہونا شروع کر رہے تھے۔ انھوں نے دوبارہ شادیاں کر لی تھیں، دُکانیں اور کارخانے کھول لیے تھے، اور بعضوں نے تو بچّے بھی پیدا کر لیے تھے۔ وہ اچانک سرطان یا عارضۂ قلب کا شکار ہو جاتے جسے ہٹلر یا اسٹالن کے زمانے کا اثر بتایا جاتا۔

ایک دن مَیں کیفےٹیریا گیا تو ایستھر نظر آئی۔ وہ ایک میز پر اکیلی بیٹھی تھی۔ یہ وہی ایستھر تھی، بلکہ اس کا فَر والا ہیٹ بھی وہی تھا۔ لیکن خاکستری بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر جھُول رہی تھی۔ تعجب یہ کہ فَر والا ہیٹ بھی خاکستری لگ رہا تھا۔ دوسرے کیفےٹیریائی اُس میں دلچسپی لیتے نظر نہیں آ رہے تھے، یا شاید اسے جانتے ہی نہیں تھے۔ اس کے چہرے پر گزرے ہوے وقت کی چھاپ عیاں تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوے تھے۔ اس کی نگاہ اب اتنی شفّاف نہ لگتی تھی۔ اس کے دہن کے گرد ایسے تاثرات تھے جنھیں تلخی یا خوابوں کی شکست کہا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کی مزاج پُرسی کی۔ وہ مسکرائی لیکن اس کا تبسّم فوراً ہی زائل ہو گیا۔ میں نے پوچھا، "کیا ہو گیا ہے تمھیں؟"

"اوہ! زندہ ہوں۔"

"بیٹھ سکتا ہوں؟"

"ضرور۔ یقیناً۔"

"کافی لاؤں تمھارے لیے؟"

"نہیں۔ خیر، اگر آپ مُصر ہیں تو۔"

میں نے دیکھا کہ وہ سگریٹ پی رہی ہے اور اس کے ہاتھ میں وہ اخبار نہیں جس میں مَیں لکھتا ہوں، بلکہ وہ ایک حریف اخبار پڑھ رہی ہے۔ وہ دشمن سے جا ملی تھی۔ میں اس کے لیے کافی لایا اور اپنے لیے دَم پُخت آلو، جو قبض کا علاج ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔

"کہاں تھیں تم؟ میں تمھارے بارے میں پوچھتا رہا ہوں۔"

"واقعی؟ شکریہ۔"

"کیا ہوا؟"

"کچھ اچھا نہیں ہوا۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ میں جان گیا کہ اس نے بھی مجھ میں وہی کچھ دیکھ لیا ہے جو مَیں نے اُس میں دیکھا ہے، یعنی بدن کا سست رو انتشار۔ وہ بولی، "حالاں‌کہ آپ کے سر پر ایک بھی بال نہیں، لیکن لگتا ہے آپ کا سر بالکل سفید ہو گیا ہے۔"

ہم کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر میں نے کہا، "تمھارے ابّا---" جوں‌ہی میں نے یہ الفاظ ادا کیے میں جان گیا کہ اُس کا باپ اب زندہ نہیں ہے۔

ایستھر بولی، "ان کا انتقال ہوے تو تقریباً ایک سال ہو گیا۔"

"تم اب بھی بٹنوں کا کام کرتی ہو؟"

"نہیں۔ اب مَیں لباسوں کی ایک دُکان میں آپریٹر ہوں۔"

"تمھارے ساتھ ذاتی طور پر کیا بیتی ہے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟"

"اوہ، کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ آپ یقین نہیں کریں گے، لیکن میں یہاں بیٹھی آپ ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں ایک طرح کے جال میں پھنس گئی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ اسے کیا نام دوں۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید آپ کوئی مشورہ دے سکیں۔ کیا اب بھی آپ کے پاس اتنا وقت ہے کہ مجھ جیسے چھوٹے لوگوں کے مسائل سن سکیں؟ نہیں، یہ کہہ کر میں آپ کی توہین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے تو اس میں بھی شک تھا کہ میں آپ کو یاد رہی ہوں گی۔ قصّہ مختصر، میں کام کرتی ہوں، لیکن کام کرنا میرے لیے دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے جوڑوں کا درد رہنے لگا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میری ہڈّیاں چٹخ جائیں گی۔ صبح آنکھ کھلتی ہے تو اٹھا نہیں جاتا۔ ایک ڈاکٹر کہتا ہے کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں خرابی ہے، دوسرا میرے اعصاب کا علاج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک نے میرے ایکس رے لیے ہیں؛ اس کا کہنا ہے کہ مجھے رسولی ہے۔ وہ مجھے اسپتال میں داخل کرنا چاہتا ہے، مگر مجھے آپریشن کی جلدی نہیں ہے۔ اچانک میری ملاقات ایک وکیل سے ہو گئی۔ وہ خود بھی پناہ گزیں ہے اور جرمن حکومت سے وابستہ ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے، ان دنوں تلافی کی رقم مل رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں روس فرار

ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود میں ناتسیوں کا نشانہ بنی ہوں۔ اور پھر انھیں میری سوانح عمری کا ٹھیک سے پتا بھی نہیں ہے۔ مجھے پنشن اور چند ہزار ڈالر مل سکتے ہیں، لیکن اس مقصد کے لیے میری ریڑھ کی ہڈی بےکار ہے، کیوں‌کہ یہ شکایت مجھے بعد میں، یعنی کیمپوں کے بعد ہوئی ہے۔ اس وکیل کا کہنا ہے کہ میری واحد امید فقط یہ ہے کہ انھیں اپنی جسمانی تباہی کا یقین دلا دوں۔ گو حقیقت یہی ہے، لیکن میں اسے ثابت کیسے کروں؟ جرمن ڈاکٹر، نیورولوجسٹ اور سائیکیٹرِسٹ ثبوت مانگتے ہیں۔ ہر چیز ایسی ہی ہونی چاہیے جیسی نصابی کتابوں میں درج ہے۔ وکیل کی خواہش ہے کہ میں پاگل بن جاؤں؛ ظاہر ہے اسے تلافی کی رقم کا بیس فیصد یا اس سے زیادہ ملے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے اتنی دولت کیوں درکار ہے۔ وہ عمر کی ساتویں دہائی میں تو پہنچ چکا ہے، اور اس کے آگے پیچھے بھی کوئی نہیں ہے۔ اس نے میرے ساتھ ہم بستری کرنے کی کوشش کی، اور کیا کچھ نہیں کیا۔ وہ خود نیم پاگل ہے۔ لیکن میں پاگل کیسے بن جاؤں، جب کہ میں واقعی پاگل ہوں؟ میں اس سارے قصّے سے اکتا گئی ہوں۔میں ڈرتی ہوں کہیں سچ مچ ہی دیوانی نہ ہو جاؤں۔ مجھے فریب دہی سے نفرت ہے، لیکن یہ چلتا پُرزہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ صبح جب الارم بجتا ہے تو میں اتنی ہی شکستہ اٹھتی ہوں جتنی روس میں صبح چار بجے جنگل سے لکڑیاں لانے اٹھا کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ خواب آور گولیاں استعمال کرتی ہوں۔ نہ کروں تو بالکل سو ہی نہیں سکتی۔ کم و بیش، یہ ہے صورتِ حال۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ تم اب بھی ایک خوش شکل عورت ہو۔"

"پھر وہی پرانا سوال۔۔ کوئی ہے ہی نہیں۔ اور پھر اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ میں اس بارے میں کیا محسوس کرتی ہوں تو کبھی ایسا سوال نہ کرتے۔"

۴

چند ہفتے گزر گئے۔ کئی دن برف باری ہوتی رہی۔ برف کے بعد بارش آئی اور پھر کہر۔ میں اپنی کھڑکی میں کھڑا براڈوے کا نظارہ کر رہا تھا۔ پیدل چلنے والے چلتے کم اور پھسلتے زیادہ تھے۔ کاریں آہستہ آہستہ چل رہی

تھیں- چھتوں پر قرمزی رنگ کا بےمہ و ستارہ آسمان چمک رہا تھا- گو ابھی شام کے آٹھ ہی بجے تھے لیکن اس روشنی اور سونےپن سے پوپھٹے کا تاثر ہو رہا تھا- دُکانیں ویران پڑی تھیں- لمحہ بھر کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں وارسا میں ہوں- ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اس طرح لپکا جیسے دس بیس تیس سال پہلے لپکتا تھا، جب مجھے اُس اچھی خبر کا انتظار تھا جو ٹیلی فون لانے والا تھا- میں نے ہیلو کہا لیکن کوئی جواب نہ آیا، اور مجھے اس خوف نے جکڑ لیا کہ کوئی بدروح آخری لمحے میں اچھی خبر کو روکنے کی کوشش کر رہی ہے- پھر میں نے بڑبڑانے کی آواز سنی- ایک نسوانی آواز نے میرا نام لیا-

"جی- بول رہا ہوں-"

"تکلیف دینے کی معافی چاہتی ہوں- میرا نام ایستھر ہے- ہم چند ہفتے قبل کیفےٹیریا میں ملے تھے---"

"ایستھر؟" میں پکار اٹھا-

"بڑی مشکل سے آپ کو فون کرنے کی جرأت کی ہے- ایک مسئلے پر بات کرنی ہے آپ سے- بشرطےکہ آپ کے پاس وقت ہو اور--- گستاخی کی معافی چاہتی ہوں-"

"گستاخی کیسی؟ تم میرے ہاں آنا پسند کرو گی؟"

"اگر میں مخِل نہ ہوں- کیفےٹیریا میں بات کرنا مشکل ہے- وہاں اتنا شور ہوتا ہے، اور پھر کن سوئیاں لینے والے بھی بہت ہیں- جو کچھ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں ایک ایسا راز ہے جو کسی اور کو نہیں بتا سکتی-"

"آ جاؤ- میں انتظار کر رہا ہوں-"

میں نے اسے راستا سمجھایا- پھر اپنے کمرے کو کچھ ٹھیک ٹھاک کرنے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ناممکن ہے- خطوط اور مسوّدے میزکرسیوں پر پڑے تھے- کونوں میں کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر تھے- میں نے الماری کھولی اور جو کچھ سامنے تھا -- پتلونیں، قمیصیں، جیکٹیں، جوتے، سلیپر -- سب اندر جھونک دیا- میں نے ایک لفافہ اٹھایا اور حیرانی سے دیکھا کہ وہ ابھی تک بند ہے- میں نے اسے کھولا تو ایک چیک برآمد ہوا- "مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے؟" میں نے بلند آواز میں کہا- میں نے چیک کے ساتھ آیا ہوا خط پڑھنے کی کوشش کی لیکن چشمہ کہیں رکھ کر بھول گیا تھا- میرا قلم بھی غائب تھا- خیر--- اور

میری چابیاں کہاں گئیں؟ مجھے گھنٹی کی آواز سنائی دی اور میں فیصلہ نہیں کر پایا کہ وہ دروازے کی تھی یا ٹیلی فون کی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایستھر تھی۔ برف باری شاید پھر ہونے لگی تھی کیوں‌کہ اس کا ہیٹ اور کوٹ کے شانے سفیدی سے سجے ہوے تھے۔ میں نے اسے اندر آنے کو کہا۔ میری پڑوسن، جو مطلقہ تھی اور ڈھٹائی سے کھلے عام میری جاسوسی کرتی تھی (جو، خدا جانتا ہے، کسی مقصد کے بغیر تھی)، اپنا دروازہ کھول کر میری مہمان کو گھورنے لگی۔

ایستھر نے اپنے جوتے اتارے اور میں نے اس کا کوٹ لے کر انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کی جِلدوں کے اوپر رکھ دیا۔ میں نے سوفے پر سے چند مسوّدے ایک طرف گرائے تاکہ وہ آرام سے بیٹھ سکے۔ میں نے کہا، "میرے گھر میں سراسر ابتری ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔"

میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا جو موزوں اور رومالوں سے بھری ہوئی تھی۔

کچھ دیر ہم موسم کی باتیں کرتے رہے اور پھر گفتگو کا رخ نیویارک میں رات کے وقت، یا سرِشام، باہر نکلنے کے خطرے کی طرف مڑ گیا۔ پھر ایستھر کہنے لگی، "آپ کو یاد ہے میں نے اپنے وکیل کے بارے میں بات کی تھی اور بتایا تھا کہ تلافی کی رقم کے سلسلے میں مجھے سائیکیئٹرِسٹ کے پاس جانا ہے؟"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔"

"میں نے پوری بات نہیں بتائی تھی۔ بات ہی اتنی عجیب تھی کہ خود مجھے اب تک ناقابلِ یقین محسوس ہوتی ہے۔ میری بات مت کاٹیے گا، میں التجا کرتی ہوں۔ میں پوری طرح صحت مند نہیں ہوں، بلکہ اگر خود کو بیمار کہوں تو غلط نہ ہو گا۔ لیکن میں حقیقت اور سراب میں فرق کر سکتی ہوں۔ میں کئی راتوں سے نہیں سوئی ہوں اور آپ کو فون کرنے کے بارے میں تذبذب کا شکار رہی ہوں۔ میں نے فون نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن آج شام مجھے محسوس ہوا کہ اگر یہ بات آپ کو نہیں بتا سکی تو پھر دنیا میں کسی کو نہیں بتا سکوں گی۔ میں آپ کی تحریریں پڑھتی ہوں، اور مجھے معلوم ہے کہ آپ پُراسرار باتوں کا ادراک رکھتے ہیں۔" ایستھر نے یہ سب کچھ ہکلاتے ہوے، ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ اس کی آنکھیں پل بھر کو

مسکرائیں اور پھر اداس اور ڈھل مِل ہو گئیں۔

میں نے کہا، "تم مجھے ہر بات بتا سکتی ہو۔"

"ڈرتی ہوں کہیں آپ مجھے پاگل نہ سمجھ لیں۔"

"میں قَسم کھاتا ہوں، نہیں سمجھوں گا۔"

ایستھر نے اپنا نچلا ہونٹ چبایا۔ "میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے ہٹلر کو دیکھا ہے۔"

باوجود اس کے کہ میں کسی غیرمعمولی بات کے لیے تیار تھا، میرا حلق سکڑنے لگا۔ "کہاں؟ کب؟"

"دیکھا، آپ تو ابھی سے ڈر گئے! یہ تین سال پہلے کی بات ہے؛ بلکہ چار سال ہو گئے ہوں گے۔ میں نے اسے یہاں، براڈوے پر، دیکھا تھا۔"

"سڑک پر؟"

"کیفےٹیریا میں۔"

میں نے حلق میں پھنستا ہوا لعاب نگلنے کی کوشش کی۔ "غالباً اُس سے ملتاجُلتا کوئی شخص،" آخرکار میں نے کہا۔

"میں جانتی تھی کہ آپ یہی کہیں گے۔ لیکن یاد رکھیے، آپ سننے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ آپ کو کیفےٹیریا کی آتش زدگی یاد ہے؟"

"ہاں۔ یقیناً۔"

"اس واقعے کا تعلّق آتش زدگی ہی سے ہے۔ چوں‌کہ آپ کو میرا یقین بہرحال نہیں ہے، اس لیے بات کو لمبا کرنے سے کیا حاصل؟ یہ سب اس طرح ہوا۔ اُس رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ عام طور پر جب نیند نہیں آتی تو میں اُٹھ بیٹھتی ہوں اور چائے بناتی ہوں یا کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ لیکن اُس بار کسی طاقت نے مجھے کپڑے پہن کر باہر جانے پر مجبور کر دیا۔ میں بتا نہیں سکتی کہ میں کس طرح اتنی رات گئے براڈوے پر چلنے کی ہمّت کر سکی۔ یقینی طور پر تین بجے کا عمل رہا ہو گا۔ میں، یہ سوچتی ہوئی کہ شاید کیفےٹیریا رات بھر کھلا رہتا ہو گا، وہاں پہنچ گئی۔ میں نے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اندر مدّھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے گھومنے والے دروازے کو گھمایا تو وہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوئی تو نظروں کے سامنے وہ منظر تھا کہ قیامت تک نہ بھولوں گی۔ میزیں ایک ساتھ ملا کر رکھی ہوئی تھیں اور ان کے گرد ڈاکٹروں یا اَردلیوں کی سی سفید عبائیں پہنے ہوئے لوگ بیٹھے تھے۔ اُن کی

آستینوں پر سواستِکا کے نشان تھے۔ میز کے سرے پر ہٹلر بیٹھا ہوا تھا۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ پوری بات سن لیں۔ بعض اوقات پاگل بھی سُنے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔ وہ سب لوگ جرمن بول رہے تھے۔ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ سب اپنے فیوہرر کے ساتھ مصروف تھے۔ پھر خاموشی چھا گئی اور اُس نے بولنا شروع کیا -- وہی خوفناک آواز جو مَیں کئی بار ریڈیو پر سن چکی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، ٹھیک سے میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اس قدر خوف زدہ تھی کہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اچانک اُس کے ساتھیوں میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑ گئی، اور وہ کرسی سے اُچھل پڑا۔ میں نہیں جانتی کہ زندہ سلامت باہر کیسے نکل آئی۔ میں پوری طاقت سے دوڑ رہی تھی اور میرے تمام بدن پر کپکپی طاری تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے اپنےآپ سے کہا: ایستھر، تمھارا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ میں اب تک نہیں جانتی کہ وہ رات میں نے کیسے کاٹی۔ اگلی صبح مَیں سیدھی کام پر نہیں گئی بلکہ کیفےٹیریا کا رخ کیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ واقعی اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اس قسم کا تجربہ تو اپنے حواس پر سے اعتبار اٹھا دیتا ہے۔ وہاں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ کیفےٹیریا جل چکا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس کا تعلّق رات والے واقعے سے ہے۔ رات جو لوگ وہاں تھے وہ تمام نشانیاں مِٹا دینا چاہتے تھے۔ یہ سیدھے سادے حقائق ہیں۔ میرے پاس ایسا عجیب واقعہ گھڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

ہم دونوں خاموش تھے۔ پھر میں نے کہا، "یہ تمھارا تخیّل تھا۔"

"تخیّل تھا -- کیا مطلب؟"

"ماضی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ برسوں پہلے کا کوئی تصوّر کہیں چوتھی جہت میں موجود تھا اور عین اُس لمحے تمھارے سامنے آ گیا۔"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے، ہٹلر نے لمبی سفید عبا کبھی نہیں پہنی۔"

"شاید پہنی ہو۔"

"کیفےٹیریا کو اُسی رات کیوں جلنا تھا؟"

"شاید آگ ہی نے تمھارے تخیّل کو اُبھارا ہو۔"

"اُس وقت آگ نہیں لگی تھی۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ یہی کہیں گے۔ اگر وہ محض تخیّل تھا تو یہاں آپ کے ساتھ میرا بیٹھنا بھی تخیّل ہے۔"

"اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ چلو مان لیا ہٹلر زندہ ہے اور یہاں ریاست ہائے متحدہ میں چھپا ہوا ہے۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ

وہ اپنے رفیقوں سے براڈوے کے کیفےٹیریا میں ملاقات کرے؟ علاوہ ازیں، کیفےٹیریا کا مالک یہودی ہے۔"

"میں نے اُسے اسی طرح دیکھا جیسے اِس وقت آپ کو دیکھ رہی ہوں۔"

"تم نے صرف ماضی کی ایک جھلک دیکھی۔"

"خیر، یوں‌ہی سہی۔ لیکن مجھے اُس وقت سے چَین نہیں ہے۔ اسی واقعے کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ اگر میری قسمت میں پاگل ہونا لکھا ہے تو اس کا موجب یہی واقعہ ہو گا۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور میں چونک کر اس کی طرف لپکا۔ کوئی غلط نمبر مل گیا تھا۔ میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ "تمھارے وکیل نے جو تمھیں سائیکیئٹرِسٹ کے پاس بھیجا تھا اس کا کیا رہا؟ اُسے یہ واقعہ بتا دو۔ تمھیں پورا معاوضہ مل جائے گا۔"

ایستھر نے مجھے تیکھی نظروں سے غیردوستانہ انداز میں دیکھا۔ "میں آپ کا مطلب سمجھ گئی۔ میں ابھی اتنی نہیں گِری ہوں۔"

مجھے ڈر تھا کہ ایستھر فون کرنے کا سلسلہ جاری رکھے گی۔ میں نے اپنا فون نمبر بدلوانے کا منصوبہ بھی بنا لیا تھا۔ لیکن ہفتوں، مہینوں گزر گئے، اس کا فون آیا نہ میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کیفےٹیریا جانا چھوڑ دیا تھا لیکن ایستھر کا خیال مجھے اکثر آ جایا کرتا تھا۔ دماغ ایسے ڈراونے خوابوں کو کس طرح جنم دے سکتا ہے؟ کھوپڑی میں بند اس ذرا سے گودے میں کیا کچھ ہوتا رہتا ہے؟ اور پھر کسی کے پاس کیا ضمانت ہے کہ ایسے واقعات اس کے ساتھ پیش نہیں آئیں گے؟ اور پھر ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انسانی نسل کا خاتمہ اسی طرح نہیں ہو گا؟ میں نے اکثر اس خیال پر غور کیا ہے کہ تمام انسانیت شیزوفرینیا کا شکار ہے۔ ایٹم کے ساتھ ساتھ آدم زاد کی شخصیت بھی مُنقسِم ہوتی رہی ہے۔ ٹیکنولوجی کے معاملے میں دماغ ابھی تک اپنا کام کرتا ہے مگر باقی چیزوں میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی ہے۔ کمیونسٹ ہوں یا فاشسٹ؛ جمہوریت کے مبلّغ ہوں یا شاعر، ادیب اور مصوّر؛ علمائے‌دین ہوں یا دہریے؛ سب کے سب پاگل ہیں۔ جلد ہی ٹیکنولوجی بھی منتشر ہونے والی ہے۔ عمارتیں ڈھے جائیں گی؛ بجلی گھر

بجلی پیدا کرنا بند کر دیں گے؛ جنرل خود اپنی ہی آبادیوں پر بم گرا دیں گے؛ جنونی انقلابی گلی کوچوں میں عجیب عجیب نعرے لگاتے پھریں گے۔ میں نے اکثر سوچا ہے کہ یہ سب کچھ نیویارک سے شروع ہو گا۔ اِس عروس البلاد میں ایک پاگل ہونے والے ذہن کی ساری علامات ہیں۔

لیکن چوں‌کہ ابھی پاگل پن کا مکمّل غلبہ نہیں ہوا، لہٰذا وائہنگر کے اصول، "گویا کہ"، کے مطابق، آدمی یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہے گویا کہ نظم و ضبط برقرار ہے۔ میری مشقِ قلم جاری تھی۔ میں ناشروں کو مسوّدے پہنچاتا تھا؛ تقریریں کرتا تھا؛ سال میں چار بار وفاقی حکومت کو چیک بھیجتا تھا؛ اور اخراجات کے بعد بچ رہنے والی رقم کو بینک میں جمع کراتا تھا۔ زرشمار میری بینک کی کتاب میں چند اعداد درج کر دیتا، جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ میری ضروریات کا انتظام ہو گیا ہے۔ اخبار یا رسالے میں کوئی شخص چند سطریں لکھ دیتا، جو اس بات کی مظہر ہوتیں کہ ادیب کی حیثیت سے میری قدر بڑھ گئی ہے۔ میں حیرت سے اپنی تمام کاوِشوں کو کاغذ میں ڈھلتے دیکھتا۔ میرا گھر گویا ردّی کی ایک بڑی سی ٹوکری تھا۔ اور یہ تمام کاغذ روزبروز سوکھتے چلے جا رہے تھے۔ رات کو اس خوف سے میری آنکھ کھل جاتی کہ کہیں یہ آگ نہ پکڑ لیں۔ کوئی پَل ایسا نہ تھا جب مجھے آگ بُجھانے والی گاڑیوں کے سائرن سنائی نہ دیتے ہوں۔

ایستھر سے آخری ملاقات کے ایک سال بعد، میں ٹورانٹو جا رہا تھا جہاں مجھے "یِدِش -- انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں" کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ میں نے اپنے تھیلے میں چند قمیصیں ڈال لی تھیں اور ہر قسم کے کاغذات، جن میں ایک وہ کاغذ بھی تھا جس کی رو سے میں ریاست ہائے متحدہ کا شہری ہوں۔ گرینڈ سنٹرل تک ٹیکسی میں جانے کے لیے میری جیب میں کافی پیسے تھے، لیکن ساری ٹیکسیاں بھری ہوئی تھیں اور جو خالی تھیں وہ رکنے سے انکاری تھیں۔ کیا مَیں ڈرائیوروں کو نظر نہیں آ رہا تھا؟ کیا مَیں اچانک اُن میں سے ایک بن گیا تھا جو سب کو دیکھتے ہیں لیکن کسی کو نظر نہیں آتے؟ میں نے زیرِزمین ریل سے جانے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں مَیں نے ایستھر کو دیکھا۔ وہ تنہا نہیں تھی، بلکہ ایک ایسے شخص کے ساتھ تھی جسے میں برسوں پہلے سے، ریاست ہائے متحدہ میں آنے کے فوراً بعد سے، جانتا تھا۔ وہ ایسٹ براڈوے کے ایک کیفےٹیریا کا مستقل بیٹھنے والا تھا۔ وہ ایک میز پر بیٹھا اظہارِ رائے اور نکتہ چینی کیا کرتا تھا اور آپ ہی آپ

بڑبڑاتا رہتا تھا۔ وہ کوتاہ قامت تھا؛ اس کے پچکے ہوے رخساروں کی رنگت اینٹ کی سی تھی اور آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ وہ نئے لکھنے والوں سے ناراض رہتا اور پرانوں کی تضحیک کیا کرتا تھا۔ وہ سگریٹ خود بنا کر پیتا اور راکھ اُنھیں پلیٹوں میں جھاڑتا جن میں ہم کھاتے تھے۔ مجھے اُس سے ملے ہوے تقریباً دو دہائیاں گزر چکی تھیں۔ اور یہاں وہ ایستھر کے ساتھ تھا بلکہ اس کا بازو تھامے ہوے تھا۔ میں نے ایستھر کو بھی اِتنا خوش رُو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ نیا کوٹ پہنے ہوے تھی اور اس کا ہیٹ بھی نیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور سر کو جنبش بھی دی۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن مجھے دیر ہو رہی تھی۔ میں ریل بمشکل پکڑ سکا۔ میرا بستر تیار تھا، سو میں نے کپڑے بدلے اور سونے کو لیٹ گیا۔

نصف شب کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ میرا ڈبّا کاٹ کر الگ کیا جا رہا تھا۔ میں بستر سے گرتے گرتے رہ گیا۔ اس کے بعد نیند اُچٹ گئی۔ میں نے اُس پستہ قد آدمی کا نام یاد کرنے کی کوشش کی جسے ایستھر کے ساتھ دیکھا تھا، لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ جو بات مجھے یاد آئی وہ یہ تھی کہ تیس برس قبل بھی وہ جوانی سے بہت دور تھا۔ روس میں انقلاب آنے کے بعد وہ ۱۹۰۵ میں ریاست ہائے متحدہ آیا تھا۔ یوروپ میں اُس کی شہرت ایک مقرّر اور عوامی شخصیت کی تھی۔ اس کی عمر اَب کیا ہو گی؟ میرے حساب سے اسّی بلکہ نوّے کے پیٹے میں ہونا چاہیے تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے بڈھے سے ایستھر کی شناسائی ہو؟ لیکن اُس شام وہ بوڑھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں اندھیرے میں لیٹا اِس مسئلے پر جتنا بھی غور کرتا، یہ اُتنا ہی ناقابلِ فہم معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی گمان ہوا کہ شاید کہیں، کسی اخبار میں، مَیں اس کی موت کی خبر پڑھ چکا ہوں۔ کیا لاشیں بھی براڈوے پر گھومتی ہیں؟ اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ایستھر بھی زندہ نہیں تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکایا اور بیٹھ کر باہر دیکھنے لگا۔ رات بالکل سیاہ اور ناقابلِ سرایت تھی۔ چاند کیا، ستارے بھی مفقود تھے۔ چند ستارے تھوڑی دیر ریل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور پھر ڈوب گئے۔ ایک روشن کارخانہ نمودار ہوا۔ میں نے مشینیں دیکھیں لیکن انھیں چلانے والا کوئی نظر نہ آیا۔ پھر اندھیرے نے اسے نِگل لیا اور ستاروں کے ایک اَور جھرمٹ نے ریل کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں زمین کے ساتھ اس کے محور پر گھوم رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ سورج کے گِرد چکر لگا رہا تھا اور ایک ایسی کہکشاں کی سمت

بڑھ رہا تھا جس کا نام میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ کیا موت کا کوئی وجود نہیں؟ یا پھر زندگی ہی کوئی شے نہیں؟

ایستھر نے کیفےٹیریا میں ہٹلر کو دیکھنے کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، مَیں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس وقت یہ بات مجھے واہیات لگی تھی، لیکن اب میں نے اسے پرکھنا شروع کیا۔ اگر کانٹ کے مطابق زمان و مکاں ادراک کی صورتوں سے زیادہ کچھ نہیں، اور مقدار، معیار، علّت و معلول محض خیال کے مختلف درجے ہیں، تو ہٹلر اپنے ناتسیوں کے ساتھ براڈوے کے کیفےٹیریا میں اجلاس کیوں نہیں کر سکتا؟ ایستھر کی بات پاگل پن نہیں لگتی تھی۔ اُس نے حقیقت کا وہ حصّہ دیکھ لیا تھا جسے آسمانی احتساب اصولی طور پر ممنوع قرار دیتا ہے۔ اُس نے مظاہر کے پردے کے پیچھے کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ میں پچھتانے لگا کہ اُس سے مزید تفصیلات کیوں نہ پوچھیں۔

ٹورانٹو میں ان مسائل پر غور کرنے کا وقت نہیں ملا، لیکن جب میں نیویارک لَوٹا تو نجی تفتیش کے لیے کیفےٹیریا گیا۔ وہاں صرف ایک ہی جاننے والا مل سکا جو کبھی ربی تھا لیکن منکر ہونے کے بعد اس نے اپنا پیشہ ترک کر دیا تھا۔ میں نے ایستھر کے بارے میں اس سے پوچھا۔ وہ بولا، "وہ چھوٹے قد کی خوب صورت عورت جو یہاں آیا کرتی تھی؟"

"ہاں۔"

"میں نے سنا ہے کہ اس نے خودکشی کر لی۔"

"کب؟ کیسے؟"

"یہ پتا نہیں۔ ممکن ہے ہم دو مختلف عورتوں کے بارے میں بات کر رہے ہوں۔"

میں نے بُہتیرے سوال کیے اور بار بار ایستھر کا حلیہ بیان کیا لیکن سارا معاملہ مبہم ہی رہا۔ کسی نوجوان عورت نے جو کیفےٹیریا میں آیا کرتی تھی، گیس کھول کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا، سابق ربی اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا۔

میں نے تہیّہ کر لیا کہ جب تک ایستھر اور اِیسٹ براڈوے کے کیفےٹیریا میں بیٹھنے والے اُس نیم ادیب اور نیم سیاست داں کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہ کر لوں چَین سے نہ بیٹھوں گا۔ لیکن روزبروز میری مصروفیات بڑھتی گئیں۔ کیفےٹیریا بند ہو گیا۔ علاقے کے خدوخال بدل گئے۔ برسوں گزر

گئے، لیکن میں نے ایستھر کو پھر کبھی نہ دیکھا۔ ہاں، لاشیں یقیناً براڈوے پر گھومتی ہیں۔ لیکن ایستھر نے اسی مخصوص لاش کو کیوں منتخب کیا؟ وہ تو اِس دنیا میں بھی اس سے بہتر سودا کر سکتی تھی۔

آئزک باشیوس سنگر

انگریزی سے ترجمہ : راشد مفتی

تیسرا

باہر قیامت کی گرمی تھی لیکن کیفےٹیریا کی فضا خنک تھی۔ دن میں، تین سے پانچ بجے تک کے دوران، یہاں تقریباً ساری میزیں خالی رہتی تھیں۔ میں نے دیوار کے قریب والی ایک میز منتخب کی اور ایپل کیک کے ساتھ کافی پیتے ہوئے ایک مسٹری میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا۔ مدیر کے نام خطوط والے حصّے میں ایک عورت نے لکھا تھا کہ اس کی بلّی کار سے کچل کر مر گئی تھی؛ وہ اسے دفن کر چکی ہے، لیکن بلّی اب بھی ہر رات اس سے ملنے آتی ہے۔ خط کے نیچے عورت کا نام اور پتا درج تھا۔ وہ ٹیکسَس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی۔ خط کی عبارت سے خلوص عیاں تھا اور اس کے سچ ہونے میں شک نہیں تھا۔ لیکن میں سوچنے لگا: کیا واقعی نُوری پیکر کا وجود ہے؟ اور کیا جانور بھی نُوری پیکر رکھتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مجھے اپنے سارے فلسفے میں ترمیم کرنی پڑے گی۔

قبل اس کے کہ میں اتنے بڑے کام کا آغاز کرتا میں جا کر کاؤنٹر سے کافی کا ایک اَور کپ لے آیا۔ "ایک حقیقت کا دوسری حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔" میں نے اپنےآپ کو سمجھایا۔

میں آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ گلابی قمیص میں ملبوس ایک نوجوان گھڑدوڑ کی کتاب پڑھتے ہوئے لگاتار سگریٹ پیے جا رہا تھا۔ اس کی ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں اور راکھ سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ دو میزیں چھوڑ کر ایک لڑکی اخبار میں "ضرورت ہے" کے اشتہار دیکھ رہی تھی۔ بائیں طرف دروازے کے پاس سفید داڑھی اور لمبے سفید بالوں والا ایک طویل قامت آدمی بیٹھا تھا۔ وہ قدیم امریکا کی ایک یادگار لگ رہا تھا۔

میں اسے اکثر دیکھا کرتا تھا۔ وہ دیکھنے میں غریب لیکن صاف ستھرا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ کوئی کتاب ہوتی تھی۔ کیا وہ کوئی مذہبی ہے؟ یا قدیم مکتبِ فکر کا کوئی دہریہ؟ کوئی صلح جُو یا سبزی خور؟ ارواح پرست یا انتشار پسند؟ میں اس کے بارے میں کافی دنوں سے متجسّس تھا لیکن اس کی حقیقت جاننے کی کوشش میں نے کبھی نہیں کی۔

دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آیا۔ گو میں اسے پہچان گیا لیکن اس کا نام اور اس سے ملاقات کی جگہ مجھے یاد نہ آئی۔ وہ کوتاہ قامت تھا اور اس کے الجھے ہوئے بال ریت کے رنگ کے تھے۔ جسم کی مناسبت سے اس کا سر بہت بڑا تھا۔ عمر چالیس اور پچپن کے درمیان کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ تکان اس کے پژمردہ چہرے سے عیاں تھی۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں اونچی، ناک چپٹی، بالائی ہونٹ لمبا اور ٹھوڑی بالکل بچوں کی سی تھی۔ وہ اسپورٹس شرٹ اور لِنن کی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ چیک مشین پر پہنچ کر وہ جھجھکا اور اپنی زرد آنکھیں دائیں سے بائیں گھمانے لگا جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کا چہرہ کِھل اٹھا۔ اس نے تیزی سے ایک چیک کھینچا اور مشین سے ایک زوردار گونج پیدا ہوئی۔ وہ جھجھکتے ہوئے قدموں سے میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پیروں میں دو تسموں والے سینڈل تھے۔ لگتا تھا اس نے نیویارک کی گرمی سے نباہ کر لیا ہے، جبکہ مَیں سوٹ، ہیٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا۔ وہ قریب پہنچ کر لُبلِن کے خطّے کی مانوس پولِش یِدِش زبان میں بولا، "بھری دوپہر میں تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ ٹھنڈے ہو رہے ہو؟ میں بیٹھ سکتا ہوں؟ تمھارے لیے کچھ لاؤں؟" وہ ذرا ناک میں بولتا تھا۔

"نہیں، شکریہ۔ بیٹھ جاؤ۔"

"تم نے ایک بار میرے ہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔" اس نے کہا۔ "لیکن اس شہر کا چلن ہی ایسا ہے۔ کسی کے پاس وقت ہے نہ صبر۔ شاید تم سے میرا نمبر کھو گیا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لوگوں کے نمبر اور پتے لکھتا ہوں اور وہ گم ہو جاتے ہیں۔ کیا تم یہاں اکثر آتے رہتے ہو؟ کبھی مَیں بھی یہاں مستقل آیا کرتا تھا لیکن اب تو شاذ ہی آنا ہوتا ہے۔ میری بیوی تمھارے بارے میں کئی بار پوچھ چکی ہے۔ کیا تم یہاں سے قریب ہی رہتے ہو؟"

اس سے پیشتر کہ میں جواب دیتا، وہ چھوٹے چھوٹے تیز قدم اٹھاتا

کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ "یہ ہے کون؟" میں نے اپنےآپ سے پوچھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں یہ وقت تنہا گزارنا چاہتا تھا۔

وہ یخ کافی کا ایک گلاس اور ایک سموسہ لے کر لوٹ آیا۔ "میں فلم دیکھنا چاہتا تھا،" وہ بولا، "لیکن تنہا کون جائے۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ آج کل کون سی فلمیں چل رہی ہیں۔ لیکن شاید تم میرا ساتھ دینا پسند کرو۔ تم میرے مہمان ہو گے۔"

"نہیں، شکریہ۔ مجھے فلم دیکھنے کی ذرا بھی خواہش نہیں۔"

"نہیں؟ اصولاً تو میں بھی فلمیں نہیں دیکھتا تاوقتےکہ میری بیوی مجھے مجبور نہ کر دے۔ لیکن آج تو مَیں چند گھنٹے بیٹھ کر روزمرّہ کے غم بھلانا چاہتا تھا۔ میں بیشتر وقت پردے کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ وہ گولیاں چلائیں، گانے گائیں یا جو جی چاہے کریں، مجھے پروا نہیں۔ چونکہ آدمی جانتا ہے کہ وہ فلم کے پردے پر کسی منظر کو بدل نہیں سکتا لہٰذا وہ عقیدۂ جبر کا قائل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ حقیقت بھی ایک فلم ہی ہے۔ تم نے کبھی ایسا محسوس کیا ہے؟"

"ہاں۔ لیکن حقیقی فلم میں ہم سب کا اپنا اپنا کردار ہوتا ہے۔ تھوڑا بہت انتخاب کا اختیار ہوتا ہے۔ ہم بُرا یا بَھلا کوئی بھی کردار ادا کر سکتے ہیں۔"

"گویا تم انسان کے مختار ہونے پر یقین رکھتے ہو۔ مجھے اس پر یقین نہیں؛ قطعاً نہیں۔ ہم کٹھ پُتلیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ کوئی ڈوری کھینچتا ہے اور ہم ناچنے لگتے ہیں۔ میں تو جبریّت کا قائل ہوں۔"

"اس کے باوجود جب سڑک پر کوئی کار تمھیں کچلنے لگتی ہے تو تم بھاگ پڑتے ہو۔"

"یہ بھی جبریّت ہی ہے۔ میں نے اخبار میں ایک واقعہ پڑھا تھا۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کو باہر لے گیا۔ کھانے کے بعد وہ روسی طرز کا جُوا کھیلنے لگے۔ اور ہاں اور نہیں کے درمیان اس نوجوان نے اپنی جان لے لی۔ ہر شخص اپنا مقدّر آزمانا چاہتا ہے۔ کافی دنوں سے رسالوں میں تمھارا نام نظر نہیں آ رہا؟"

"میں نے کوئی چیز چھپوائی نہیں ہے۔"

"یہی وجہ ہے -- اگر تم اسے وجہ کہہ سکو -- کہ میں لینڈلارڈ بن گیا ہوں۔ میں نے سجے سجائے کمروں والی ایک عمارت خرید لی ہے اور اب وہی

میری گزراوقات کا ذریعہ ہے۔ کبھی زیادہ آمدنی ہو جاتی ہے کبھی کم، لیکن میں کسی مدیر کی رائے سننے سے بہرحال محفوظ ہوں۔ لوگ مجھے پیشگی کرایہ دیتے ہیں۔ کرائےداروں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ چاہے کوئی قاتل ہو یا چور، دلّال ہو یا اٹھائی گیرا، جو بھی مجھے پانچ ڈالر دے میں اسے چابی تھما دیتا ہوں۔ آج مجھے اپنے لیے ایک کمرہ چند گھنٹوں کو درکار تھا لیکن کوئی خالی ہی نہ تھا۔ مشکل ہی سے کوئی خالی رہتا ہے۔" اس نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور بھویں اٹھا کر بولا، "تم مجھے پہچانتے تو ہو؟"

"میں تمھیں جانتا ہوں، لیکن مجھے بہت افسوس ہے کہ تمھارا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ مجھے بُھولنے کا مرض ہے۔"

"میں فوراً ہی سمجھ گیا تھا۔ فنگربین -- زیلک فنگربین۔ یہ میرا قلمی نام ہے۔ میرے اصل نام سے اب مجھے کوئی نہیں پکارتا۔ ہماری ملاقات کیفے رایل میں ہوئی تھی۔"

"یقیناً! اب مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھاری بیوی بےحد خوب صورت ہے۔ اس کا نام جینیا ہے۔"

"اچھا، تو تمھیں یاد آ گیا! میں چہرے اور واقعات اکثر بھول جاتا ہوں۔ میں نظمیں لکھا کرتا تھا اور انھیں چھپواتا بھی تھا۔ لیکن ان دنوں کسی کو شاعری سے دلچسپی نہیں رہی۔ یہ ایک غیرضروری جنسِ تجارت ہے۔ اس کے باوجود آج بھی ایسے جذبات کا وجود ہے جنھیں صرف شاعری ہی زبان دے سکتی ہے۔ ذرا غزل الغزلات کا کسی اور صنف میں تصوّر تو کرو! لیکن اب یہ باتیں متروک ہیں۔ محبّت موت کی طرح اٹل ہے۔ رقابت قبر کی طرح سفّاک ہے۔ بلکہ اوتھیلو بھی۔ رقیب ہونا اور کسی کو گلا گھونٹ کر مار دینا اب اتنا بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ حقیقی محبّت معاف کر دینے کا نام ہے۔ مہذّب انسان کو رقابت پر قابو پانا ابھی سیکھنا ہے، کہ یہی سب سے بڑا فن ہے۔ سگریٹ پیو گے؟"

"نہیں۔"

"پی لو۔ بعض اوقات سگریٹ معاون ثابت ہوتا ہے۔ عورتوں نے نسل در نسل دکھ جھیلے ہیں۔ کبھی کثرتِ ازواج اور حرموں کے باعث، کبھی اُن مردوں کے ہاتھوں جو لڑائیوں سے لوٹتے وقت داشتائیں ساتھ لے آتے تھے۔ اب کڑوی گولی مردوں کو نگلنی ہو گی۔ عورتوں کی اشتہا بھی ہماری جیسی ہے، بلکہ شاید زیادہ ہے۔ میری باتوں کو ہنسی میں مت اڑاؤ۔ معاشرے کے

نچلے طبقے ان باتوں میں ہم سے کہیں آگے ہیں۔ گو میں نے سنا ہے کہ یوروپیوں نے بھی اس سلسلے میں بعض بڑے اقدام کیے ہیں۔ اگر برطانیہ کا بادشاہ ایک امریکی مطلقہ سے شادی کی خاطر تخت چھوڑ سکتا ہے تو یہ صرف اخباری شہ سرخیوں کا مضمون نہیں بلکہ نئے دور اور نئے انسان کی علامت ہے۔"

زیلک فنکربین نے اپنی چھوٹی سی مٹھی میز پر رکھی۔ اس نے سموسہ چکھا اور پلیٹ کو پرے دھکیل دیا۔ اس نے پوچھا، "تم فارغ ہو؟"

"ہاں، میں فارغ ہوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ اپنے اس عمل پر مجھے پچھتانا پڑے گا۔ لیکن چونکہ میں فلم دیکھنے نہیں گیا اور تمہارے ساتھ بیٹھ گیا، اس لیے میں تمہیں ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جس کا تعلّق تم سے بھی ہے۔"

"مجھ سے؟ کیسے؟"

"تمہاری ذات سے نہیں، تمہاری تحریروں سے۔"

کوتاہ قد زیلک فنکربین نے پیچھے کی طرف اس طرح دیکھا گویا اسے اپنی بات سن لیے جانے کا خوف ہو۔ اس کی نیم متبسّم اور نیم سوالیہ زرد آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ وہ بولا، "جو کچھ میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں وہ کسی اور کو ہرگز معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ہر شخص کو ایک رازدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ راز جب تک کسی اور کو معلوم نہ ہو، راز نہیں ہوتا بلکہ محض ایک پوشیدہ بات ہوتی ہے۔ اس بات کا تعلّق میری بیوی سے ہے۔ ہم دونوں میں بہت محبّت ہے۔ میں جب کنوارا تھا تو میرا خیال تھا کہ شادی شدہ جوڑے کے درمیان کسی قسم کی محبّت ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ شادی کے ادارے سے بڑھ کر کسی ادارے کی تضحیک نہیں کی جاتی۔ لیکن ان تضحیک کرنے والوں میں سے اکثر، جلد یا بدیر، کسی ربی کے پاس جا کر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ ایک شادی ناکام ہو تو وہ دوسری، تیسری، حتیٰ کہ پانچویں آزماتے ہیں۔ بلاشبہ بوڑھے کنوارے اور کنواریاں بھی خاصی تعداد میں ہیں لیکن شادی کا ارمان انہیں بھی ہے۔ وہ آخری لمحے تک تلاش جاری رکھتے ہیں۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ میری بیوی خوب صورت ہے۔ شکریہ۔ میں بتا نہیں سکتا کہ شادی سے قبل وہ کس قدر خوب صورت تھی۔ ہم دونوں کیلسی کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا تعلّق نوجوانوں کی ایک تنظیم سے تھا اور

وہیں ہم متعارف ہوے تھے۔ تنظیم کے سارے نوجوان اس کے گرویدہ تھے، اور کچھ تو بڑی شدّت سے اسے چاہتے تھے۔ ظاہر ہے میں جسمانی طور پر اوروں سے کمتر تھا لیکن ذہانت میں، بہرحال، ان سے زیادہ تھا۔ میں اور جینیا ایک دوسرے سے شدید محبّت کرنے لگے۔ میں پولینڈ کی فوج میں بھرتی ہونے کا روادار نہ تھا، لہذا ہم دونوں ۱۹۲۴ میں امریکا آ گئے اور وہ بھی عین اُس روز جو امریکا میں داخلے کا آخری دن تھا۔ ہم رات کی طرح تہی دامن تھے۔ مجھے تخلیقی کام کا وقت دینے کے لیے جینیا نے ایک دُکان میں نوکری کر لی۔ اس کا خیال تھا کہ مجھ میں دوسرا سِلویسکی یا بائرن بننے کی صلاحیت ہے۔ خیر، جیسا کہ میری ماں کہا کرتی تھی، جو سوچتے ہیں وہ خود کو بےوقوف بناتے ہیں۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نیویارک میں یِدِش زبان کے شاعر کی کیا حیثیت ہے۔ میرے جیسے حالات میں لارڈ بائرن بھی محض لینڈلارڈ بن کے رہ جاتا۔

"رفتہ رفتہ میری تخلیقی صلاحیتوں کا سحر ٹوٹتا گیا۔ لیکن ہماری باہمی محبّت اس سے بےنیاز رہی۔ مرد اور عورت کو ایک دوسرے میں کیا نظر آتا ہے، یہ بات کوئی تیسرا شخص کبھی نہیں جان سکتا۔ دن چاہے ہم پر کتنا ہی گراں رہا ہو، ہماری شامیں ہمیشہ خوشگوار ہوتی تھیں۔ ہماری سکونت بروم اسٹریٹ پر ہو یا اوشن ایوینیو پر یا برفٹن بِیچ پر، ہمارا گھر ہمیشہ روشن رہتا تھا۔ ہم دونوں کو خوب صورت چیزوں سے پیار تھا اور اُس زمانے میں نوادرات تھرڈ ایوینیو پر کوڑیوں کے مول مل جاتے تھے۔ ہمیں اگر کوئی غم تھا تو اپنے بےاولاد ہونے کا۔ میں ایک اسکول میں یِدِش زبان پڑھانے لگا تھا اور میری تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ کبھی کبھار جب کسی مدیر کو اپنے پرچے میں خالی جگہ بھرنی ہوتی تو وہ میری بھی کوئی چیز لگا دیتا تھا۔ جینیا کو دُکان پر ترقی مل گئی تھی اور ہم اپنی آمدنی میں سے کافی کچھ بچا لیتے تھے۔ ہم گرمیاں کیٹسکلز کے ایک ہوٹل میں گزارتے تھے۔ ہم سارے امریکا میں گھومتے اور بعض اوقات تو یوروپ بھی جاتے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود مَیں بطورِ شاعر اپنی ناکامی سے نباہ نہ کر سکا، اور اس کا دُکھ جینیا کو بھی تھا۔ ہمارا ایک بڑا شوق مطالعہ تھا۔ ادب سے مجھے عشق تھا اور جینیا بھی کتابوں کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ شروع شروع میں ہم یِدِش اور پولِش ادب پڑھتے تھے لیکن بعد میں جب ہم نے انگریزی سیکھ لی تو انگریزی ادب بھی پڑھنے لگے۔ میں شیخی نہیں بگھار

رہا، لیکن ہم دونوں کا ذوق بہت عمدہ ہے۔ تمھیں معبد کا وہ سازندہ یاد ہے جس کا کہنا تھا: میں گا نہیں سکتا لیکن گانا سمجھتا ضرور ہوں۔ جینیا کا ذوق مجھ سے بھی بہتر ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ غبی اور بہرے لوگ تو ادب کے نقاد اور پروفیسر ہیں لیکن جینیا، جسے لفظوں کی مکمّل پرکھ ہے، ایک دُکان میں ملازم ہے۔ خیر، یہ سب تو اس دنیا کی منافقت کا حصّہ ہے۔ سچ پوچھو تو ہمیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ جینیا کی نوکری اس قسم کی تھی کہ اس کے پاس کافی وقت بچ رہتا تھا، اور بِدِش اسکولوں کا حال تو تم جانتے ہی ہو۔ ہم اپنے گھر پر چھوٹی موٹی تقریبیں کرتے رہتے تھے اور ہمارے مہمان اکثر وہی گنتی کے چند دوست ہوتے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ ہمیں ایک دوسرے کی قربت پسند تھی۔ اور اکثر تو مہمانوں کے جانے کے بعد ہم خدا کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔ کتنے جوڑے ہوں گے جن کی زندگی ایسی خوشگوار ہو؟

"لیکن اپنی بیوی سے بےانتہا محبّت کے باوجود، میں دوسری عورتوں کے بارے میں کبھی بےحِس نہیں رہا۔ مجھے اس بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ آخر آج کی دنیا میں ہمارے پاس ترغیب کے خلاف کیا مدافعت ہے؟ میں پارسا نہیں ہوں، اور اگر ہوتا بھی تو یہودیوں میں ایک سے زیادہ عورتیں رکھنا درحقیقت کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ عیسائی ہیں جنھوں نے ہم پر یک زوجی کی پابندی تھوپ دی ہے۔ میں چاہے بائرن نہ بن سکا ہوں لیکن عورتوں کے لیے میری اشتہا اس سے کسی طرح کم نہیں۔ ہمارا معاشرتی ماحول تو تم جانتے ہی ہو۔ مواقع کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں کسی معاشقے میں سنجیدگی سے نہیں الجھا لیکن وقتاًفوقتاً دوسری عورتوں سے دل بہلاتا رہا۔ شروع شروع میں مَیں یہ باتیں جینیا سے چھپاتا تھا، لیکن اس کی حِسیں بہت تیز ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ وہ میرا ذہن پڑھ سکتی ہے۔ اس نے میرے اعتراف پر کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کیا۔ بس اتنا کہا: جو تمھارا جی چاہے کرو، لیکن میرے پاس لوٹ آنا؛ جو کچھ مَیں تمھیں دے سکتی ہوں کوئی دوسری عورت نہیں دے سکتی۔ وہی مخصوص نسوانی باتیں۔ مجھے یہ بھی احساس ہونے لگا کہ میرے نام نہاد معرکے اس میں ایک نئی خواہش جگا دیتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔

"حالات برسوں اسی ڈھرے پر چلتے رہے۔ ہماری شامیں اور راتیں

کتابوں میں پڑھی ہوئی حقیقتوں اور خوابوں پر باتیں کرتے گزرتی تھیں۔ دوسری عورتوں سے قربت کی آزادی رکھنے کے باوجود، مَیں اکثر لوگوں کی طرح اپنی بیوی کو باعصمت دیکھنا چاہتا تھا۔ پہلےپہل تو جینیا نے مجھے تنبیہ کی کہ اگر میں نے دوسری عورتوں کا پیچھا کیا تو وہ بھی دوسرے مردوں سے تعلّق پیدا کرے گی۔ لیکن وقت گزرتا گیا اور ہر چیز جوں کی توں رہی۔ جینیا فطرتاً شرمیلی ہے اور یہ شرم خدا جانے کتنی نسلوں کا بخشا ہوا ورثہ ہے۔ اس نے مجھے خود بتایا کہ کسی اَور کی قربت کا تصوّر ہی اس کے بدن میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔ ہم ایک کھیل کھیلا کرتے تھے: تم اگر خود کو ایسی صورتِ حال میں پاؤ تو کیا کرو گے؟ اور صورتِ حال ہم اکثر پدِش اخباروں میں چھپی تمھاری کہانیوں سے لیا کرتے تھے۔ ادب زندگی پر کس قدر اثر ڈالتا ہے، خدا جانے تمھیں اس کا احساس ہے یا نہیں۔ ہم نے تمھارے کرداروں پر غالباً تم سے بھی زیادہ غور کیا ہے۔

"میں اگر تمھارے ساتھ کل تک بیٹھا رہوں تب بھی ہزارواں حصّہ نہیں سنا پاؤں گا۔ لیکن میں مختصراً بیان کروں گا۔ جینیا نے اصرار شروع کر دیا کہ مرد اور عورت کی نفسیات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ بلکہ اس نے اپنے لیے ایک دوست ڈھونڈنے کی بات بھی کی۔ میں نے اس کی بات کو دل لگی جانا۔ اس کی چھیڑچھاڑ نے مجھے اُکسا دیا، اور جذباتی اشتعال کا مطلب تم جانتے ہی ہو۔ اس نے پوچھا کہ اگر کوئی مرد اسے بھا گیا اور وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی تو میرا ردِعمل کیا ہو گا۔ کیا میں اسے چھوڑ دوں گا؟ اسے پیار کرنا ترک کر دوں گا؟ اور اگر میں نے ایسا کیا تو کیا اس سے یہ ثابت نہ ہو گا کہ میں دوہرے معیار رکھتا ہوں؟ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ جیسا کہ انگریزی کہاوت ہے، جو کچھ نَر ہنس کے لیے درست ہے وہی مادہ ہنس کے لیے بھی درست ہے۔ لیکن یہ سب باتیں بےکار تھیں۔ جینیا کو مسلسل اُکسایا جا رہا تھا اور وہ مسلسل انکار کیے جا رہی تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس نے مجھ سے نباہ صرف اپنے کو یہ باور کرانے کو کیا تھا کہ وہ ایک جدید شہری عورت ہے کوئی دقیانوسی دیہاتن نہیں۔

"وہ ایک حقیقی الجھاؤ کا شکار ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی، جو کچھ مادام بوواری یا آنا کرنینا یا تمھاری ہداسا یا کلیرا کر سکتی ہیں، مَیں کیوں نہیں کر سکتی؟ دُکان میں کام کرنے والی دوسری لڑکیاں اپنی کامیابی کے بارے میں بڑھاچڑھا کر باتیں کیا کرتی تھیں۔ اِن دنوں ہمیں ورغلانے کے لیے

شیطان کو اپنی آواز بلند نہیں کرنی پڑتی۔ اس کا یہ کام فن کی دیویاں کر دیتی ہیں۔ اور جینیا کسی مقدّس کنواری کی طرح ان کی نظروں کے سامنے موجود تھی۔ اس نے اپنے غیرترقی یافتہ ہونے کا دُکھڑا ڈاکٹروں اور ماہرینِ محبّت کی اصطلاحی زبان میں رونا شروع کر دیا۔

"ہنسو مت۔ جینیا نے اپنے لیے عاشق ڈھونڈنے میں مجھ سے مدد مانگی۔ کیا یہ پاگل پن نہیں ہے؟ اس نے کہا؛ میں یہ کام اکیلی نہیں کر سکتی؛ میرے لیے کوئی شخص ڈھونڈو۔ وہ صرف ایک بار یہ جاننا چاہتی تھی کہ ترقی یافتہ ہونے کا مطلب کیا ہے۔ ایک رات ہم نے بیٹھ کر امیدواروں کی فہرست بنائی۔ یہ ایک کھیل تھا۔ میں پچاس سال سے زیادہ کا ہوں اور جینیا بھی اتنی جوان نہیں ہے۔ ہم دادا دادی ہو سکتے تھے، لیکن اس کے بجائے آدھی رات کو بیٹھے ممکنہ عاشقوں کی فہرست بنا رہے تھے۔ کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں ہے؟"

"اتنی زیادہ نہیں۔"

"ٹھہرو۔ میں اپنے لیے کافی لے آؤں۔"

زیلِک فنکربین کافی کے دو کپ لے کر لوٹا، ایک اپنے لیے اور ایک میرے لیے۔ وہ چسکی لیتے ہوئے بولا، "مطالعے کے دوران ایک لفظ اکثر میری نظر سے گزرا ہے؛ زن یار، یعنی بیوی کا عاشق۔ اس لفظ کا مفہوم مَیں کبھی نہ سمجھ پایا۔ آخر کوئی شخص اپنی بیوی کو بےوفائی کی اجازت کیوں دینے لگا؟ ایسے شخص کو اپنے گھر ہی میں کیوں بلانے لگا؟ میرا خیال تھا کہ یہ لفظ ناول نویسوں اور ڈرامانگاروں کی اختراع ہے۔ کیلسی میں تو اس طرح کا کوئی رواج نہ تھا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہاں امریکا میں اس کا وجود ہے۔ اداکار، ڈاکٹر، تاجر، سبھی اس میں ملوّث ہیں۔ ایسے لوگ واقعی موجود ہیں جو اپنی بیوی کے عاشق سے دوستی کر لیتے ہیں؛ اکٹھے کھاتے پیتے ہیں، تھیٹر جاتے ہیں۔ میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے۔ لیکن اب میرے ہاں بھی ایک زن یار ہے، اور یہی وجہ ہے کہ میں تمھارے ساتھ یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں فلم پر جانا چاہتا تھا۔ جب وہ آتا ہے تو میں گھر سے نکل پڑتا ہوں۔ ممکن ہے وہ زن یار نہ ہو، لیکن وہ میرے ہاں آیا کرتا ہے اور میں اس بارے میں جانتا ہوں۔

"معاملہ اس طرح شروع ہوا۔ چند سال پہلے پولینڈ سے ایک رِفیوجی آیا تھا۔ ہو سکتا ہے تم اُسے جانتے ہو، لہٰذا میں صرف اس کا پہلا نام ظاہر

کروں گا، جو میکس ہے۔ اگرچہ وہ پولینڈ میں پلابڑھا ہے لیکن یدش بہت عمدہ بولتا ہے۔ وہ مصوّر بھی ہے، کم از کم اس کا دعوی تو یہی ہے۔ وہ کینوس پر چند دھبّے ڈال کر انھیں غروبِ آفتاب یا بُل فائٹ کا منظر بتاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ لوگ اس کی تصویریں خریدتے ہیں۔ آج کل کے خریدنے والے بھی اتنے ہی ڈھونگیے ہیں جتنے پیش کرنے والے۔ تصویر اپنے پیروں پر کھڑی ہو تو گھٹیا ہے، لیکن اسے سر کے بل کھڑا کر دو تو وہ فن پارہ ہے۔ میری اُس کی ملاقات کیفے رایل میں ہوئی تھی۔ وہ ایک چاپلوس قسم کا آدمی ہے۔ اس کی مضطرب نظریں ہر وقت محبّت، دوستی اور خدا جانے کس کس شے کی متلاشی رہتی ہیں۔ تعارف ہوتے ہی وہ مجھ سے اس طرح لپٹ گیا جیسے میں اس کا مدتوں کا بچھڑا بھائی ہوں۔ اس نے فوراً ہی میرا پورٹریٹ بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے بتایا کہ اس کا خاندان بھی کیلسی میں ہے، اور باتوں باتوں میں کھلا کہ وہ میرا دوردراز کا رشتےدار بھی ہے۔ لوگ مجھ سے بہت زیادہ خلوص برتیں تو عموماً اس کی وجہ جینیا ہوتی ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ لیکن میری اور میکس کی ملاقات جینیا کی عدم موجودگی میں ہوئی تھی اور بالآخر جب اس نے جینیا کو دیکھا بھی تو اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ جینیا نے اس بات میں اپنی ہتک محسوس کی۔ وہ مردوں کی عدم توجّہ کی عادی نہیں ہے۔

"میکس کے بنائے ہوے پورٹریٹ میں مَیں آدھا بَن مانس اور آدھا مگرمچھ نظر آتا تھا۔ جدید مصوّر اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں! بعد میں کھلا کہ وہ ایک چالاک بیوپاری ہے۔ وہ نوادر اور زیوروں کا کاروبار کرتا تھا۔ بہت ہی کم وقت میں اس کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہو گیا۔ وہ ہمیں طرح طرح کی چیزیں دکھانے لگا۔ چاندی کی طشت، ہاتھی دانت کی سوئیاں، تمباکو کی ڈبیاں اور خدا جانے کیا کیا آلابَلا۔ جینیا تو ایسی چیزوں کی دیوانی ہے، اور پھر میکس کی بتائی ہوئی قیمتیں غیرمعمولی طور پر کم تھیں۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ وہ ٹھیک آدمی نہیں ہے۔ اس نے میرا پورٹریٹ بنانے میں مہینوں لگا دیے۔ وہ مجھے حسرت ناک نظروں سے دیکھتا اور مجھے چُھونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک بار تو اس نے مجھے پیار کرنے کی بھی کوشش کی۔ میں دنگ رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے صاف لفظوں میں مجھے بتا دیا کہ اسے مجھ سے محبّت ہے۔ اس بات سے میرا جی متلا گیا۔ میں نے اس سے کہا، میکس، اپنےآپ کو تماشا مت بناؤ۔ میں

اس حماقت سے اتنا ہی دور ہوں جتنا زمین سے آسمان۔ اور اس نے ایک ٹھکرائے ہوے عاشق کی طرح آہیں بھرنی شروع کر دیں۔

"میں نے یہ واقعہ جینیا کو بتایا۔ وہ بھی حیران رہ گئی۔ ٹھیک ہے، ہم ایسی باتوں کے بارے میں پڑھتے رہتے ہیں، لیکن یہی باتیں جب اپنے ساتھ پیش آئیں تو یقین نہیں آتا۔ ہمیں راتوں کو گپ شپ کے لیے ایک نیا موضوع مل گیا تھا۔ جینیا کو اس بات پر شدید غصّہ تھا کہ مردوں کے لیے مَیں اس سے زیادہ دلکش ہوں۔ میں نے میکس سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا، لیکن ایسا کرنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میکس جان چھوڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ اس نے ہمارے ہاں آنا جانا جاری رکھا، اور وہ جب بھی آتا تو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتا تھا۔ وہ تھیٹر کے سارے لوگوں کو جانتا تھا، اور صرف سیکنڈ ایوینیو والوں کو نہیں بلکہ براڈوے والوں کو بھی۔ اس طرح جس کھیل کو دیکھنے کے لیے ہمیں مہینوں انتظار کرنا پڑتا، اُس کی بدولت شروع ہی میں دیکھ لیتے تھے۔ وہ ہمیں سیرتفریح کی جگھوں اور ہوٹلوں میں لے جاتا تھا۔ میں حیرت سے سوچتا تھا: کیا زن یار ایسے ہوتے ہیں؟ ایک بار تھیٹر دیکھتے ہوے اس نے میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے بتا دیا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو میں اس سے قطع تعلق کر لوں گا۔ میں اس سارے معاملے سے اُکتا گیا تھا۔

"لیکن مجھ میں اور جینیا میں اچانک ایک طرح کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ مجھے اس پر بڑا تعجّب تھا۔ ایک حسین عورت اس کی توجّہ حاصل کرنا چاہتی تھی اور وہ میری صورت تکتا رہتا تھا۔ جینیا اس سے مخاطب ہوتی تو وہ سنتا ہی نہ تھا، لیکن میں کوئی چھوٹی سی بات بھی کہتا تو وہ ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ کیا اس سے زیادہ مضحک کوئی اَور بات ہو سکتی ہے؟ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس کی وجہ سے میری گھریلو زندگی برباد ہو رہی ہے۔ ہر رات ہم دونوں اسے اپنی زندگی سے نکالنے کی مختلف تدبیریں سوچتے۔ ہر رات ہم فیصلہ کرتے، لیکن اگلے ہی دن میکس بغل میں کوئی تحفہ دبائے پھر چلا آتا۔ وہ ہمیں کوئی نادر شے بیچنے کی پیشکش کرتا یا پھر کوئی سنسنی خیز کہانی سنانا چاہتا۔ اور قبل اس کے کہ میں انکار کر سکوں، جینیا اسے کھانے کے لیے کہہ دیتی۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس کے سارے نوادر جعلی تھے اور اس کی بیشتر تصویریں بھی نقل تھیں۔ یہ شخص سر سے پاؤں تک فراڈ ہے۔

"میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ جینیا اس سے تنہا ملنے لگی۔ اس نے اپنی کل وقتی نوکری چھوڑ دی اور ہفتے میں صرف دو دن کام پر جانے لگی۔ اسی دوران میں نے سجے سجائے کمروں والی عمارت خرید لی تھی اور میری ساری توجّہ اس پر مرکوز تھی۔ اب مجھے اس احمق کی محبّت بھری نظریں برداشت کرنے کا یارا نہ تھا۔ جینیا اب بھی اس سے متاثر تھی، لیکن بظاہر وہ اسے مجھ سے چرا لینا چاہتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میکس کے اطوار عورتوں کے سے تھے۔ وہ باتونی تھا، عورتوں کی چیزیں رکھتا تھا اور تقریباً ساری انگلیوں میں نگینوں والی انگوٹھیاں پہنتا تھا۔ اس کے بال تیل ڈالنے کی کثرت سے لمبے اور چمک دار تھے۔ اسے کپڑوں کا خبط تھا۔ پستہ قد مَیں ہوں لیکن اونچی ایڑی والے جوتے وہ پہنتا تھا۔ اور اس کی ٹائیاں! کون عورت ہے جو ایسی لغویات برداشت کرے گی؟ تم مجھے بےوقوف کہو گے لیکن یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہ آئی کہ جینیا اس سے معاشقہ کرنے لگے گی۔"

"معاشقہ؟ اس کے باوجود کہ وہ ہم جنس پرست ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ چوں‌کہ اس کی ہر چیز فراڈ ہے لہٰذا ممکن ہے یہ بات بھی جھوٹ ہو۔ ہو سکتا ہے میرے ساتھ اس کی تفریح محض جینیا تک پہنچنے کا بہانہ ہو۔ وہ پرانا گھاگ ہے۔ رفتہ رفتہ جب میں اس سے کھنچ گیا تو وہ اور جینیا شِیروشکر ہو گئے۔ وہ اکٹھے کھانا کھاتے، تھیٹر اور فلمیں دیکھتے اور نمائشوں منیں جاتے۔ میں احتجاج کرتا تو جینیا کہتی: تم اس سے جلتے ہو؟ مجھ سے زیادہ تو وہ تم میں دلچسپی لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی وہ دونوں کہیں جاتے مجھے ضرور پوچھتے، مگر میں ہمیشہ انکار کر دیتا۔ جینیا نے مجھے قسم کھا کر بتایا کہ میکس نے اسے کبھی چُھوا تک نہیں، اور میں نے جینیا پر یقین کر لیا۔ یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔ انسان میں خودفریبی کی صلاحیت حیران کن ہے۔ علاوہ ازیں، میں فلموں، تھیٹروں اور تحفوں کے اس سارے سلسلے سے تھک چکا ہوں۔ گھر میں رنگ ہونا تھا اور میں حیران تھا کہ سامان کہاں رکھوں۔ لاکھوں ایجادیں ہو چکی ہیں لیکن گھر میں رنگ کرانے کا بحران اپنی جگہ پر ہے۔ اسے ٹالنے والی ایجاد ہنوز ہونی باقی ہے۔ سارا اسباب اچانک باہر آ جاتا ہے، دیواروں سے تصویریں اتر جاتی ہیں، کتابیں فرش پر ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ رنگ کی بُو سے جی متلانے لگتا ہے۔ آدمی خود اپنے گھر میں اجنبی ہو جاتا ہے اور

اس پر یہ تلخ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ دوسری تمام چیزوں کی طرح گھر بھی محض سراب ہے۔

"مجھے محسوس ہونے لگا کہ ہر چیز ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ اور پھر ایک رات جینیا نے اعتراف کر لیا کہ میکس سے اس کا معاشقہ چل رہا ہے۔"

زیلِگ فِنکربین نے اپنی باقی ماندہ کافی ایک گھونٹ میں حلق میں انڈیل لی۔ وہ مجھے ملامتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "اتنے حیرت زدہ کیوں ہو؟ تم جدید آدمی کی طرح لکھتے ہو لیکن تمہارے دل میں بھی قدیم اخلاقیات اور تعصّبات کا انبار ہے۔ کبھی میں بھی ان کی گرفت میں تھا، لیکن میں نے خود کو آزاد کرا لیا۔ آج کی عورت کو ایک ہی مرد کے ساتھ پوری عمر گزارنے کی سزا نہیں دی جا سکتی، چاہے وہ مرد اس کا پسندیدہ ہی کیوں نہ ہو۔ جینیا سے بڑھ کر نباہ کرنے والی عورت مشکل ہی سے ملے گی، لیکن وہ بیسویں صدی میں رہتی ہے۔ اسے یہ سوچنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ تمام نیویارک میں زیلِگ فنکربین ہی واحد مرد ہے۔ اس کے باوجود جب اس نے اپنے معاشقے کے بارے میں بتایا تو میں بوکھلا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو اسے گھسیٹ کر دارالعقوبت لے جاتا اور سنگسار کرا دیتا۔ لیکن نیویارک میں کوئی دارالعقوبت نہیں ہے۔ میں اپنا اسباب سمیٹ کر رخصت ہو سکتا تھا، لیکن کہاں جاتا؟ کس کے پاس؟ جس رات جینیا نے مجھے یہ بات بتائی، ہم دونوں بستر میں تھے۔ وہ کسی ننّھی بچّی کی طرح چلّا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا: مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تم کہو تو تم سے وابستگی کا ثبوت دینے کے لیے میں تمہارے ساتھ جان دے سکتی ہوں۔ بستر اس کی آہ و زاری سے ہل رہا تھا۔ تم مجھے احمق کہو گے لیکن میں نے اسے تسلّی دی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ کوئی المیہ نہیں ہے؛ لیکن دہشت سے میرے دانت بج رہے تھے۔ اس رات ہم دونوں نے قسم کھائی کہ اب میکس سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے، لیکن میں جانتا تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ مذہب کے بانی خدا کو بھلے ہی نہ جانتے ہوں مگر انسانی فطرت کو ضرور سمجھتے تھے۔ توریت میں لکھا ہے کہ ایک گناہ کے عقب میں کئی گناہ ہوتے ہیں۔ مروّجہ راستے سے بس ایک قدم ہٹنے کی دیر ہے کہ ساری حدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔

"تم مذہب، شادی اور جنس کے بارے میں لکھتے ہو، آج کے انسان کے سارے الجھاؤ اور پیچیدگیاں سمجھتے ہو، لیکن تم بھی تنقید کے سوا کچھ

نہیں کر سکتے۔ یقین کی طرف واپسی کا راستا نہیں دکھا سکتے۔ اپنے اجداد کی سی نیکوکاری کے بغیر اُن کی سی زندگی گزارنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ گو ایسا کرتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے لیکن میں بتا رہا ہوں۔ اُس رات جینیا تو دو گولیاں کھا کے سو گئی مگر میں پلک تک نہ جھپک سکا۔ میں گاؤن اور سلیپر پہن کر اسٹڈی میں چلا گیا۔ میں نے اپنی کتابوں کی طرف دیکھا، لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ راہِ راست نہیں دکھا سکتیں۔ تالستائی یا ڈکنز یا بالزاک کسی کو کیا سکھا سکتے ہیں؟ ان میں صلاحیت ضرور تھی لیکن وہ بھی اتنے ہی الجھے ہوئے تھے جتنے ہم ہیں۔ اچانک میری نظر تالمود کی ایک جِلد پر پڑی اور میں نے سوچا کہ دنیاوی علوم تو میرے مسئلے کا حل نہیں ہیں، کیوں نہ خدا سے رجوع کروں۔ میں نے کتاب کھولی اور پرانے وقتوں کی طرح گنگنا کر پڑھنے لگا: اگر مرغی تہوار والے دن انڈا دے تو شامی مکتب کے مطابق اسے کھایا جا سکتا ہے جبکہ ہلال مکتب کے مطابق نہیں کھایا جا سکتا۔ میں کسی مدرسے کے لڑکے کی طرح آدھے گھنٹے تک جھوم جھوم کر پڑھتا رہا۔ شروع شروع میں اس کا اثر یادِ ماضی کی طرح شیریں تھا مگر جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا میری روح بوجھل ہوتی گئی۔ ان لفظوں میں معنی اُسی وقت تک ہیں جب تک پڑھنے والے کو ان کے الہامی ہونے کا یقین ہو۔ اس یقین کے بغیر یہ تمام بات محض مکتبی ہے۔ میں تھک کر دوبارہ سونے چلا گیا۔ میں اور جینیا ایک ہی بستر میں سوتے ہیں۔ اُس رات مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کو اپنی سب سے طاقت ور جبلّت پر قابو پانا ہو گا۔ جائیداد کی طرح عورت پر اپنے حقِ ملکیت سے دستبردار ہونا ہو گا۔ خدا -- اگر اس کا وجود ہے -- غالباً ہمیں اسی سمت لے جا رہا ہے۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا؟ گو میں نے جینیا کو مجبور نہیں کیا تھا، اس نے ازخود وعدہ کیا کہ وہ آئندہ میکس سے نہیں ملے گی۔ لیکن وہ اب بھی اس سے ملتی ہے۔ اس نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ اب اسے نوکری کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اور میں رات دن اس کی نگرانی تو کرنے سے رہا۔ جینیا کی خطا ہو یا اپنا نام نہاد مہذب پن، میں ہر چیز سے تنگ آ چکا ہوں۔ براڈوے پر دکھایا جانے والا کھیل اور پکاسو کی تصویریں، سب میرے لیے اپنی کشش کھو چکی ہیں۔ حد یہ کہ مجھے ادبِ عالیہ سے بھی دلچسپی نہیں رہی۔ معاشرے کی طبقاتی

دیواریں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ منصف، وکیل اور قاتل، سبھی ایک سے خیالات رکھتے ہیں، ایک سی کتابیں پڑھتے ہیں، ایک سے کلبوں میں جاتے ہیں، ایک سی گفتگو کرتے ہیں۔ ہم غاروں کے عہد میں لوٹ رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ غار ٹیلی فون، بجلی اور ٹی وی سے مزیّن ہیں۔ میرا خیال تھا کہ میں جینیا کو اندر باہر سے جانتا ہوں، لیکن جب سے اس جعل ساز نے میرے گھر پر دھاوا بولا ہے مجھے اس میں نت نئی خصوصیات نظر آنے لگی ہیں۔ اور تو اور، اس کی آواز بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔ جہاں تک میکس کا سوال ہے میں اس سے نفرت بھی نہیں کر سکتا، اور مجھے اس بات پر سخت حیرت ہے۔ مجھے نہیں معلوم وہ حقیقت میں کون ہے، اور مجھے اس کی پروا بھی نہیں۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ وہ بھی وہی کچھ چاہتا ہے جو ہم سب چاہتے ہیں، یعنی دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے سے پہلے ہر امکانی مسرّت کا حصول۔"

"وہ ہم جنس پرست نہیں ہے؟"

"کون جانے وہ کیا ہے! غالباً ہم سب ہم جنس پرست ہیں۔ میں تمھیں خاص بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ جینیا ایک ماہرِ نفسیات کے پاس جانے لگی ہے۔ میکس اس کے پاس برسوں سے جا رہا ہے۔ وہ دونوں مجھے ایک کلب کا ممبر بنانا چاہتے ہیں لیکن میں اس کی نسبت تہوار والے انڈے پر غور کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔"

میں نے غور نہیں کیا تھا کہ کیفےٹیریا بھر چکا ہے۔ میں نے زیلِگ سے کہا، "آؤ چلیں، ورنہ یہ لوگ ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔"

ہم دونوں باہر براڈوے پر آ گئے۔ گرمی مجھے بھٹی کی طرح جلائے دے رہی تھی۔ گو ابھی روشنی باقی تھی لیکن نیون‌سائن چمکنے لگے تھے اور اپنی شعلہ فشاں زبان میں پیپسی کولا، بانڈ سوٹ، کیمل سگریٹ اور رگلے چیونگ گم کی لائی ہوئی مسرّتوں کا اعلان کر رہے تھے۔ زمین دوز راستوں کے روشن دانوں سے ایک ناگوار بُو اٹھ رہی تھی۔ ایک سنیماگھر کے اوپر نیم عریاں عورت کا چار منزل اونچا پوسٹر لٹک رہا تھا جس پر چاروں طرف سے روشنیاں پڑ رہی تھیں۔ عورت کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ اپنی ٹانگیں چوڑی کیے دونوں ہاتھوں میں پستول لیے کھڑی تھی۔ کمر کے گرد ایک جھالردار رومال نے اس کے مخصوص اعضا کو چھپا رکھا تھا۔ اسے دیکھنے کو ایک خلقت جمع تھی۔ مرد اسے دیکھ

دیکھ کر مذاق کر رہے تھے اور عورتیں منہ پر ہاتھ دھرے ہنس رہی تھیں۔ میں نے زیلِگ کی طرف دیکھا۔ کسی جدید تصویر کی طرح اس کا نصف چہرہ سبز اور نصف سرخ تھا۔ وہ پوسٹر کو گھور رہا تھا۔ اس کے لب متحرّک تھے اور اس کی ایک آنکھ میں ہنسی اور دوسری میں آنسو تھے۔ میں نے اس سے کہا، "اگر خدا نہیں ہے تو کیوں نہ اسی کو خدا مان لیں۔"

میری بات سن کر زیلِگ فِنگربین جیسے سحر سے نکل آیا۔ "ہاں، یہ جو وعدہ کر رہی ہے اسے پورا کر سکتی ہے۔"

آئزک باشیوس سنگر

انگریزی سے ترجمہ : راشد مفتی

بُوزنہ گیتزل

عزیزو، ہم سب جانتے ہیں کہ نقّال کیا ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں ایسا ہی ایک آدمی ہمارے شہر میں رہا کرتا تھا اور اسے ایک موزوں خطاب دیا گیا تھا۔ اُس زمانے میں امیر لوگوں کے سوا ہر ایک پر کوئی نہ کوئی عرفیت چپکا دی جاتی تھی۔ تاہم گیتزل اُس شخص سے زیادہ مالدار تھا جس کی نقل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس شخص کا نام تودرس برودر تھا۔ تودرس کی شخصیت اُس شان دار نام کے شایاں تھی۔ وہ درازقامت تھا، دیو کے سے چوڑے شانے، داڑھی کسی سردار کی سی ستواں، اور آنکھیں ایسی پُراسرار کہ دیکھنے والے کو اپنے اندر اترتی محسوس ہوتی تھیں۔ ہاں، میں جانتی ہوں کہ میں کیا بات کر رہی ہوں۔ میں اُن دنوں لڑکی ہی تھی، اور وہ بھی خوش شکل۔ جب وہ اپنی شعلہ فشاں آنکھوں سے مجھے گھورتا تو میری ہڈّیوں کے اندر کا گودا کپکپانے لگتا۔ ایسی نظریں کہیں کسی حاسد آدمی کی ہوں تو، خدا اپنی امان میں رکھے، نظر لگ سکتی ہے۔ مگر تودرس کے پاس حسد کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ بَیل کی طرح توانا تھا۔ اُس کی ایک بےحد خوب صورت بیوی تھی اور دو پُروقار بیٹیاں جو سچ مچ شہزادیاں لگتی تھیں۔ وہ اُمرا کی طرح رہتا تھا۔ اس کے پاس گاڑی اور کوچوان کے علاوہ ایک یکّا بھی تھا۔ وہ گاڑی چلاتا ہوا گاؤں میں جاتا اور دہقان عورتوں کے ساتھ خوش وقتیاں کرتا۔ جب وہ ان پر سکّے اچھالتا تو وہ خوشی سے چلّانے لگتیں۔ بعض اوقات وہ گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سے گزرتا۔ وہ گھوڑے پر قازقوں کی طرح تن کر بیٹھتا تھا۔

اس کا خاندانی نام برودر تھا، لیکن وہ رہنےوالا گریٹ پولینڈ کا تھا برودی کا نہیں۔ وہ تمام امرا کا قریبی دوست تھا۔ کاؤنٹ زموئسکی ہر جمعے کی رات اُس کے ہاں جفلی مچھلی کھانے آیا کرتا تھا۔ پورِم کے تہوار پر کاؤنٹ نے اسے ایک تحفہ بھیجا تھا۔ جانتے ہو وہ تحفہ کیا تھا؟ موروں کا جوڑا، ایک نَر اور ایک مادہ!

تودرس پولِش پولستانیوں کی طرح اور روسی روسیوں کی طرح بولتا تھا۔ وہ جرمن بھی جانتا تھا اور فرانسیسی بھی۔ وہ کیا نہیں جانتا تھا! اسے پیانو بجانا بھی آتا تھا۔ وہ زموئسکی کے ساتھ شکار پر جایا کرتا تھا اور ایک بار اس نے ایک بھیڑیا بھی مارا تھا۔ جب زار نے زاموس شہر کا دورہ کیا اور نفیس ترین لوگ اس کی پیشوائی کو گئے، تو جانتے ہو اُس سے بات کس نے کی؟ تودرس برودر نے۔ جوں‌ہی اس کے منہ سے پہلے تین لفظ ادا ہوے، زار قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعد میں دونوں نے شطرنج کی ایک بازی بھی کھیلی، جو تودرس نے جیتی۔ میں تو وہاں نہیں تھی لیکن غالباً ہوا ایسا ہی تھا۔ بعدازآں تودرس کو پیٹرزبرگ سے سونے کا تمغا موصول ہوا۔

اُس کا خسر، فالک پوسنر، مال دار تھا، اور اس کی بیٹی فوگل حسن و جمال کا پیکر۔ وہ جہیز میں بیس ہزار روبل لائی اور اپنے باپ کی موت کے بعد اس کی ساری دولت کی وارث ٹھہری۔ لیکن کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تودرس نے دولت کے لیے اُس سے شادی کی تھی۔ کہتے ہیں وہ اپنی ماں کے ساتھ معدنی چشموں پر جا رہی تھی کہ تودرس اچانک ریل گاڑی میں داخل ہوا۔ وہ اُس وقت تک کنوارا تھا یا رنڈوا۔ اس نے فوگل کو ایک نظر دیکھا اور اس کی ماں سے بولا کہ میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا سوچو، یہ پچاس سال پہلے کی بات ہے--- ہر شخص کا کہنا تھا کہ تودرس کے لیے تو پہلی نظر کی محبّت کا معاملہ ہوا، لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ محبّت اُس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ خدا مجھے اُتنے ہی بابرکت برسوں سے نوازے جتنی راتیں فوگل اُس کی وجہ سے بےخواب رہی! لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے کہ اگر بیلچے کو زنانہ لباس پہنا دیا جائے تو تودرس اُس کا بھی پیچھا کرنے لگے گا۔ اُس زمانے میں یہودی بیٹیاں عشق و محبّت کے بارے میں نہیں جانتی تھیں، سو اُسے غیریہودی لڑکیوں اور عورتوں کے پیچھے بھاگنا پڑتا تھا۔

زاموس کے نواح میں تودرس کی ایک جاگیر تھی جہاں بڑے بڑے امرا اس کے گھوڑوں کو سراہنے آیا کرتے تھے۔ لیکن وہ بلا کا شاہ خرچ تھا۔ اس کے قرضے سال بہ سال بڑھتے گئے اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے خسر کی دولت کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

اب بُوزنے گیتزل نے، جس کا اصل نام گیتزل بیلس تھا، تودرس برودر کی ہر بات کی نقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ امیر آدمی تھا لیکن بلا کا کنجوس۔ اس کا باپ بھی اسی شہرت کا حامل رہا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی جائیداد فاقے کر کر کے بنائی ہے۔ گیتزل کی ایک چکّی تھی جو آٹا نہیں سونا اُگلتی تھی۔ چکّی کا نگران ایک بوڑھا ملازم تھا جو گیتزل کا اُتنا ہی وفادار تھا جتنا کوئی کتّا اپنے مالک کا۔ جاڑوں میں، جب پیسنے کے لیے بہت زیادہ اناج ہوتا تو وہ ملازم راتوں کو جاگ جاگ کر کام کرتا۔ اس کے رہنے کے لیے کوئی کمرہ بھی نہیں تھا اور وہ بھوسے کی کوٹھری میں چوہوں کے ساتھ سویا کرتا۔ گیتزل اسی کی وجہ سے امیر بنا تھا۔ اُس زمانے میں لوگ خدمت کے عادی تھے؛ اگر خدا کی نہیں تو اپنے مالک کی خدمت کرتے تھے۔

گیتزل قرض پر روپیا بھی دیا کرتا تھا۔ شہر کے آدھے مکان اس کے پاس رہن تھے۔ اس کی ایک پیاری سی چھوٹی لڑکی تھی: دِشکے۔ اس کی بیوی رِشالی اتنی ہی بیمار تھی جتنی بدشکل۔ گیتزل میں تودرس بننے کی اتنی ہی صلاحیت تھی جتنی مجھ میں تیورِسک کا ربی بننے کی ہے۔ لیکن شہر میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ گیتزل دوسرا تودرس بننے کی کوششوں میں ہے۔ شروع شروع میں تو یہ صرف خوانچے والوں اور درزیوں کی گپ شپ کا موضوع تھا -- ایسی باتوں پر کون دھیان دیتا ہے؟ -- لیکن پھر خود گیتزل نے سیلِک درزی کی دُکان پر جا کر اس سے بالکل تودرس کا سا، لومڑی کی دُم سے سجا، چوڑے کالر اور کئی چاکوں والا کوٹ سینے کی فرمائش کی۔ اس کے بعد اس نے جُفت ساز سے بالکل تودرس کے سے، درمیان سے پِچکے ہوئے اور چمک دار نوکوں والے جوتے بنوائے۔ اب زاموس وارسا تو ہے نہیں۔ یہاں جلد یا بدیر ہر کسی کو پتا چل جاتا ہے کہ کوئی کیا کر رہا ہے۔ سو کسی کی نقّالی کیوں کی جائے؟ تاہم، جب یہ افواہیں تودرس کے کانوں تک پہنچیں تو اس نے صرف اتنا کہا، "میری بلا سے! اس سے تو لگتا ہے کہ وہ میرے ذوق کے بارے میں اونچی رائے رکھتا ہے۔" تودرس کبھی کسی کی برائی

نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ لُبلِن اسٹریٹ پر جا رہا ہوتا اور اس کے برابر سے بارہ سال کی لڑکی بھی گزرتی تو وہ اپنا ہیٹ اتار کر اسے یوں تعظیم دیتا جیسے وہ کوئی خاتون ہو۔ اگر کوئی بےوقوف ایسی حرکت کرتا تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے، لیکن چالاک آدمی بعض اوقات بےوقوفی کی حرکتیں کرنے کا شوق پورا کر سکتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر تودرس اتنی پیتا کہ مدہوش ہو جاتا اور ایسے ایسے لطیفے سناتا کہ لوگ سمجھتے کہ اصل ُجگت باز بیرش وینگرووور نہیں بلکہ تودرس ہے۔ جب وہ کوزوتسکی ناچنے پہ آتا تو فرش کانپنے لگتا۔

خیر، تو گیتزل بیلس دوسرا تودرس بننے پر تُل گیا۔ وہ لکڑی کے پیپے کی طرح ٹھگنا اور موٹا تھا، اور اوپر سے ہکلاتا بھی تھا۔ اسے اپنے منہ سے الفاظ نکالنے کی کوشش کرتے دیکھنا آدمی کے غش کھا جانے کو کافی تھا۔ وہ شہر والوں کے لیے اچھا خاصا تمسخر کا سامان تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک گاڑی بھی خریدی تھی لیکن وہ چھوٹی گاڑی تھی اور اس میں جو دو گھوڑے جُتے ہوے تھے وہ عمررسیدہ اور پستہ قد تھے۔ گیتزل اس میں بازار سے چکّی اور چکّی سے بازار آیا جایا کرتا تھا۔ اُسے دل پھینک دکھائی دینے کا شوق چرایا، اور اس نے دواساز کی بیوی کو ہیٹ اتار کر تعظیم دینی چاہی۔ لیکن اس سے قبل کہ ہاتھ اٹھا سکے، وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لوگ خود کو اس کے منہ پر ہنسنے سے بمشکل روک پائے اور شہر کے لونڈوں کے فوراً ہی اسے بوزنے کا خطاب دے ڈالا۔

گیتزل کی بیوی رِشالی ایک بدمزاج عورت تھی، لیکن حالات کو بھانپنے کی عقل اس میں بہرحال تھی۔ میاں بیوی میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ زاموس میں دیواروں سے کان لگا کر اور چابی کے سوراخوں سے جھانک کر ٹوہ لینے والوں کی کمی نہ تھی۔ رشالی نے اُس سے کہا، "تمھارے تودرس بننے کا اتنا ہی امکان ہے جتنا میرے مرد بننے کا! تم خود کو بےوقوف بنا رہے ہو۔ تودرس تودرس ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم گیتزل ہی رہو۔"

لیکن کسی کے سر میں کیا کھچڑی پک رہی ہے، کوئی دوسرا کیسے جان سکتا ہے! گیتزل کسی جنون کے اثر میں آیا ہوا لگتا تھا۔ وہ الفاظ اس انداز میں ادا کرنے لگا جیسے گریٹ پولینڈ کا رہنے والا ہو۔ وہ موٹے موٹے جرمن لفظ استعمال کرنے لگا۔ اس نے پتا لگایا کہ تودرس کیا کھاتا ہے، کیا پیتا ہے اور -- معاف کرنا -- کیسا جانگیہ پہنتا ہے۔ اس نے عورتوں کا پیچھا

کرنا بھی شروع کر دیا۔ اور، عزیزو، جس طرح تودرس کو ہر بات میں کامیابی ہوتی تھی، گیتزل کو ہر بات میں ناکامی ہوئی۔ وہ کسی کو کوئی لطیفہ سناتا تو جواب میں اس کی کنپٹی پر زور کا گھونسا پڑتا۔ ایک بار ایک شادی کی دعوت میں اس نے ایک عورت پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تو اس کے شوہر نے اس کے کپڑوں پر شوربہ انڈیل کر اسے شرابور کر دیا۔ دشکے چلّا چلّا کر اس سے التجا کرتی، "ابّا، سب تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں!" لیکن کہیں لکھا ہے کہ کوئی بھی ترنگ دیوانگی کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

ایک دن سرِراہ گیتزل کی ملاقات تودرس سے ہوئی۔ بولا، "میں تمھارا فرنیچر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بڑے شوق سے۔" تودرس نے کہا اور اسے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ گیتزل اس کی نقّالی کر رہا تھا تو اس میں تودرس کا کیا نقصان تھا!

سو گیتزل تودرس کی نقّالی میں لگا رہا۔ اس نے تودرس کی سی آواز بنانے کی کوشش کی۔ امرا اور ان کی بیگمات سے مراسم بڑھانے کی کوشش کی۔ اس نے غور سے ہر چیز کا مشاہدہ کیا۔ اس نے کبھی تمباکونوشی نہیں کی۔ اس نے غور سے ہر چیز کا مشاہدہ کیا۔ اس نے کبھی تمباکونوشی نہیں کی تھی، مگر اچانک اس کے پاس سِگار نظر آنے لگے، اور سِگار بھی ایسے جو خود اس کے قد سے لمبے تھے۔ اس نے پیٹرزبرگ سے نکلنے والا ایک اخبار بھی لگوا لیا۔ تودرس کی بیٹیاں ایک غیریہودی اقامتی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ گیتزل نے دشکے کو بھی وہیں بھیجنا چاہا حالاں‌کہ اب اس کی داخلے کی عمر نکل چکی تھی۔ اس پر رِشالی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور بڑی مشکل سے اسے اس سے باز رکھا۔ گیتزل اگر قلّاش ہوتا تو ایسی حرکتیں کرنے پر اسے برادری سے نکال باہر کیا جاتا، لیکن وہ تو دولت سے لدا ہوا تھا۔ تودرس نے بہت دنوں تک ان باتوں پر کوئی توجّہ نہ دی، لیکن بالآخر ایک دن وہ بھرے بازار میں گیتزل کے پاس گیا اور اس سے پوچھنے لگا، "اب کیا تم یہ بھی دیکھنا چاہتے ہو کہ میں پیشاب کیسے کرتا ہوں؟" اس کے اس طرح صاف الفاظ استعمال کرنے پر شہر کو ہنسنے کا سامان مل گیا۔

۲

اب سنو اس کے بعد کیا ہوا۔ ایک روز رِشالی چل بسی۔ اس کی موت

کس طرح ہوئی، سچ پوچھو تو مجھے نہیں معلوم۔ اِن دنوں تو لوگ سیدھے ڈاکٹر کے پاس بھاگتے ہیں۔ اُس زمانے میں آدمی بس بیمار پڑتا اور جلد ہی اس کا کام تمام ہو جاتا۔ غالباً رشالی کی موت گیتزل کی ترنکوں ہی کی وجہ سے ہوئی۔ بہرحال، وہ مر گئی اور دفنا دی گئی۔ گیتزل نے اس واقعے پر آنسو ضائع نہیں کیے۔ وہ سوگ کے ساتوں دن اسٹول پر بیٹھا تودرس کے انداز میں لطیفے سناتا رہا۔ اس کی بیٹی دِشکے کی نسبت پہلے ہی ٹھہر چکی تھی۔ سوگ کا مہینا پورا ہوتے ہی رشتہ سازوں نے پیاموں کی بھرمار کر دی۔ لیکن گیتزل کو کوئی جلدی نہیں تھی۔

دو مہینے نہ گزرے تھے کہ شہر میں غُل مچ گیا۔ تودرس برودر دیوالیہ ہو گیا تھا۔ اس نے کاروبار میں لگانے کے لیے بیواؤں اور یتیموں سے قرض لے رکھا تھا۔ دلھنوں نے اس کے کاروبار میں اپنا جہیز لگا رکھا تھا۔ امرا کا وہ الگ مقروض تھا۔ ایک سردار نے تو آ کر اسے گولی مارنے کی بھی کوشش کی۔ تودرس کی بیوی روتے روتے غش کھا گئی۔ لڑکیاں دوچھتّی میں چھپ گئیں۔ پتا یہ چلا کہ اسے گیتزل کو بھی ایک بڑی رقم لوٹانی تھی۔ غالباً کوئی رہن نامہ تھا یا خدا جانے کیا تھا۔ گیتزل اس کے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کی نوک اور عنبر کے دستے والی چھڑی تھی، بالکل ویسی جیسی تودرس کے پاس تھی، اور وہ اسے باربار فرش پر مار رہا تھا۔ تودرس نے اس سارے معاملے کو ہنس کر ٹالنا چاہا، لیکن صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی حالت غیر ہے۔ قرض خواہ اس کی تمام املاک نیلام کر دینا چاہتے تھے، خود اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے درپے تھے۔ عورتیں اسے قاتل، ڈاکو اور فریبی کہہ کر پکار رہی تھیں۔ دلھنیں چلّا رہی تھیں، "تم نے ہمارے جہیز کا کیا کِیا؟" وہ یوں آہ و زاری کر رہی تھیں جیسے یوم کِپور ہو۔ تودرس کے پاس شیر کے سے ڈیل ڈول والّا ایک کتّا تھا۔ گیتزل نے بھی کہیں سے بالکل ویسا ہی کتّا حاصل کر لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ دونوں جانور ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی کوشش کرنے لگے۔ آخرکار گیتزل نے تودرس کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں نے اپنےآپ کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور کوئی تین گھنٹے تک وہیں رہے۔ اس دوران قرض خواہوں نے سارے گھر کو تقریباً تہس نہس کر دیا۔ تودرس جب باہر آیا تو اس کا رنگ موت کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ گیتزل بھی پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ وہ لوگوں سے بولا، "بلوا مت کرو! سب کے قرض مَیں ادا کروں گا۔ تودرس کا کاروبار میں نے سنبھال لیا

ہے۔" لوگوں کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ بھلا چنگا آدمی بیماری کے بستر میں کہاں گھُستا ہے؟ لیکن گیتزل نے تو اپنا بٹوا کھولا جو بالکل تودرس کے بٹوے کی طرح لمبا اور گہرا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ تودرس کا بٹوا خالی تھا اور یہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ گیتزل نے موقعے ہی پر ادائیگیاں کرنی شروع کر دیں۔ اس نے بعضوں کا پورا قرض چکایا اور بعضوں کو پہلی قسط دی، لیکن ان سب کو اندازہ ہو گیا کہ وہ دہندہ ہے۔ تودرس خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کی بیوی فوگل خود کو سنبھال کر مسکرانے لگی۔ لڑکیاں بھی دوچھتّی سے باہر نکل آئیں۔ حد یہ کہ کتّوں تک نے آپس میں صلح کر لی، اور ایک دوسرے کو سونگھنے اور دُم ہلانے لگے۔ گیتزل نے اتنی بڑی نقد رقم کہاں سے مہیّا کی؟ اصولاً تو ہر تاجر کی رقم اس کے کاروبار میں لگی ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہو، گیتزل نے ادائیگی جاری رکھی۔ وہ اپنی لکنت پر قابو پا چکا تھا اور اب اس طرح بول رہا تھا جیسے سچ مچ وہی تودرس ہو۔ تودرس کے ہاں ایک منشی تھا جو سیکرٹری کہلاتا تھا۔ وہ سارے بہی کھاتے لے آیا تھا۔ اس اثنا میں تودرس کی حالت بھی سنبھل گئی تھی اور وہ لطیفےبازی کر رہا تھا۔ اس نے برانڈی خود بھی پی اور گیتزل کو بھی پیش کی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی صحت کا جام تجویز کیا۔

قصّہ مختصر، گیتزل نے ہر چیز کا قبضہ لے لیا۔ تودرس برودر اپنی بیوی اور بیٹیوں کو لے کر لُبلِن روانہ ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہو کیوں‌کہ خادمائیں بھی ساتھ گئی تھیں۔ لیکن وہ اپنے پَروں بھرے بستر کیوں نہیں لے گیا تھا؟ قانوناً کوئی قرض خواہ ان پر قبضہ کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ تین ماہ تک ان کی کوئی خبر نہیں آئی۔ گیتزل اب مالک بن چکا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر آتا جاتا اور تودرس کے کوچوان سے کام لیتا۔ تین ماہ بعد فوگل اپنی بیٹیوں کے ساتھ لوٹ آئی۔ انسے پہچاننا دشوار تھا۔ لوگ اس سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھتے تو وہ محض اتنا کہتی، "اب میرا کوئی شوہر نہیں ہے۔" "خدانخواستہ کوئی سانحہ؟" لوگ پوچھتے، اور وہ نفی میں جواب دیتے ہوے بتاتی کہ ان میں طلاق ہو گئی ہے۔

کہاوت ہے کہ سچائی یوں ظاہر ہو جاتی ہے جیسے تیل پانی کی سطح پر آ جاتا ہے۔ اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ان تین گھنٹوں کے دوران جب گیتزل اور تودرس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا، تودرس نے اپنی ہر چیز گیتزل کے حوالے کر دی تھی۔ اس میں اس کا مکان، جائیداد، تمام

املاک اور، سب سے بڑھ کر، اس کی بیوی بھی شامل تھی۔ ہاں، فوگل نے گیتزل سے شادی کر لی۔ گیتزل نے شادی کے تحفے میں اسے دس ہزار روبل دیے اور جائیداد کے طور پر ایک مکان، جو دراصل تودرس کا تھا، اس کے نام کر دیا۔ بیٹیوں کے لیے بھاری جہیز اس نے الگ کر کے رکھ دیا۔

شہر کی ہلچل دیدنی تھی۔ تم اگر اُس وقت زاموس میں نہیں تھے تو کبھی اندازہ نہیں کر سکتے کہ کوئی شہر کتنے ہیجان میں ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ایک نہیں بلکہ دس کتابیں۔ ایسی حرکتیں تو غیریہودی بھی نہیں کرتے۔ پر تودرس تھا ہی ایسا۔ وہ جب تک رہ سکا بادشاہوں کی طرح رہا۔ وہ جوا کھیلتا اور ہارتا رہا، اور پھر سب کچھ ختم ہو گیا؛ سو وہ مفقود ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ جیل جانے کے قریب تھا۔ اُمرا اسے قتل کر سکتے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں آدمی جان بچانے کے لیے کیا نہیں کرتا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ گیتزل کو سب کچھ پہلے سے معلوم تھا اور یہ ساری اُسی کی سازش تھی۔ اس نے تودرس کو ایک بڑی رقم قرض دلوائی تھی اور یوں اسے اپنے دام میں پھنسا لیا تھا۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ گیتزل اتنا عیّار نکلے گا۔ لیکن وہ کیا کہاوت ہے؟ اگر خدا چاہے تو جھاڑو پر بھی بُور آ سکتا ہے۔

جلد ہی تودرس کی لڑکیاں بیاہی گئیں۔ دِشکے اپنے سسرالیوں کے ساتھ رہنے لیمبرگ چلی گئی۔ فوگل گھر میں تقریباً قید ہو کر رہ گئی۔ تودرس کی زمینوں پر ایک سائبان والا باغ بھی تھا۔ وہ گرمیوں میں سارے وقت وہیں بیٹھی رہتی اور جاڑوں میں گھر میں چھپ جاتی۔ تودرس پانی میں پھینکے ہوے پتھر کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کراکو میں ہے، کچھ سمجھتے تھے کہ وہ وارسا چلا گیا ہے اور بعض کا کہنا تھا کہ اس نے عیسائیت اختیار کر کے ایک امیر عورت سے شادی کر لی ہے۔ ایسے شخص کو کون سمجھ سکتا ہے؟ اگر کوئی یہودی یوں اپنی بیوی کو بیچ دینے پر اتر آئے تو پھر وہ یہودی نہیں رہتا۔ فوگل نے اس سے بےپناہ محبّت کی تھی اور یہ ظاہر تھا کہ اس نے محض تودرس کو بچانے کے لیے ہر بات قبول کر لی تھی۔ آنے والے برسوں میں کسی شخص کی مجال نہ ہوئی کہ اس سے تودرس کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکے۔ روش ہاشانہ اور یوم کِپور کے موقعوں پر وہ زنانہ حصے میں کھڑی رہتی اور کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اس کا غرور برقرار تھا۔

گیتزل نے تودرس کی زبان اور اطوار اپنا لیے؛ بلکہ اس کا قد بھی بڑھ گیا، یا شاید اس نے اپنے جوتوں کی ایڑیاں اونچی کرا لیں۔ وہ امرا کا یارِغار بن گیا۔ افواہ یہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ ممنوعہ شراب بھی پیتا ہے۔ لکنت دور ہونے کے بعد وہ اُنھیں کی طرح پولِش بولنے لگا تھا۔

دِشکے نے اپنے باپ کو کبھی ایک سطر بھی نہ لکھی۔ تودرس کی بیٹیوں کے بارے میں مَیں نے سنا کہ ان کا انجام اچھا نہیں ہوا۔ ایک زچگی میں مر گئی؛ دوسری کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ اس نے پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ لیکن گیتزل بہرحال تودرس بن گیا، اور میں نے اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے ہوے دیکھا، شروع سے آخر تک۔ ہاں، نقّالی منع ہے۔ اگر تم کسی کا بہروپ بھرو گے تو اس کا نصیب بھی تمھیں منتقل ہو جائے گا۔ چال بازی کرنے کی اجازت تو اپنے سائے کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ زاموس میں ایک نوجوان تھا جسے اپنے سائے کے ساتھ کھیلنے کی عادت تھی۔ وہ اپنے ہاتھ اس طرح رکھ لیتا کہ دیوار پر پڑنے والا سایہ کسی چَرتے اور ٹکریں مارتے ہوے مینڈھے کی طرح دکھائی دیتا۔ ایک رات سایہ دیوار سے نکل آیا اور اس نوجوان کو گویا سچ مچ کے سینگوں سے چھید ڈالا۔ اسے ایسی ٹکر لگی کہ بعد میں اس کے ماتھے میں دو سوراخ رہ گئے۔ اور یہاں بھی ایسا ہی انجام ہوا۔

گیتزل کو اوروں کے پیسے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے پاس کافی دولت تھی۔ لیکن یکایک وہ بیواؤں اور یتیموں سے کاروبار کے لیے قرض لینے لگا۔ جہاں سے بھی قرض ملنے کا امکان ہوتا وہ فوراً لے لیتا، اور وہ بھی بہت زیادہ سود پر۔ اسے اپنی چکّی کی مشین بدلوانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی چکّی برف جیسا سفید آٹا پیستی تھی۔ لیکن اس نے نئی مشین لگوائی اور پاٹ بھی بدلوائے۔ اس کا پرانا اور وفادار ملازم فوت ہو چکا تھا۔ اس نے نیا ملازم رکھ لیا جو لمبی مونچھوں والا ایک سابق عدالتی کارندہ تھا۔ یہ نیا ملازم اسے بری طرح لُوٹنے لگا۔ گیتزل نے ایک نئی جاگیر بھی خریدی حالاں‌کہ اس کے پاس پہلے ہی ایک جاگیر، اصطبل اور گھوڑوں سمیت، موجود تھی۔ اب تک وہ یہودیت کی پابندی کرتا رہا تھا لیکن اب چھیلوں کی طرح کے کپڑے پہننے لگا اور اس نے تہواروں کے سوا عبادت گاہ جانا بھی چھوڑ دیا۔ اَور تو اَور، اس نے شراب کشید کرنے کی بھٹّی لگا لی اور بیئر بنانے کے لیے جَو اُگانے لگا۔ ان سب باتوں کی اسے ضرورت نہیں تھی، اور

سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں اس کی اچھی خاصی رقم ٹھکانے لگ گئی۔ اس نے خدا جانے کہاں سے مشینیں منگوائیں جو رات بھر ایسا شور کرتیں کہ ہمسایوں کی نیند اُڑ جاتی۔ وہ ہر چند ہفتوں کے بعد وارسا جاتا۔ کون جانے اس کے ساتھ درحقیقت کیا معاملہ ہوا۔ دس دشمن مل کر بھی آدمی کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا وہ اکیلا اپنےآپ کو پہنچا سکتا ہے۔ ایک دن یہ خبر پھیل گئی کہ گیتزل دیوالیہ ہو گیا ہے۔ عزیزو، اسے دیوالیہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی؛ یہ سب تودرس کی نقل میں تھا۔ اس نے تودرس کی بدبختی بھی لے لی تھی۔ ہر گلی کوچے سے لوگ نمودار ہو کر اس کے مکان کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے لگے۔ گیتزل کی نقّالی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی اس کی بیوی کا خواستگار نہ تھا؛ فوگل گیتزل سے کئی سال بڑی تھی۔ اس نے ہر شخص کو یقین دلایا کہ وہ انھیں ان کی کسی شے سے محروم نہیں کرے گا، پھر بھی انھوں نے اس کی پٹائی کی۔ ایک سردار نے اس کے ماتھے پر پستول رکھ دیا، بالکل اُسی انداز میں جس طرح ایک اَور سردار نے تودرس کی کنپٹی پر رکھا تھا۔

مختصر یہ کہ گیتزل آدھی رات کو فرار ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد جب قرض خواہوں نے قبضہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہر ایک کے لیے کافی سے زیادہ رقم موجود ہے۔ خدا جانے اس کے پاس کتنی دولت تھی۔ تو پھر وہ بھاگا کیوں؟ اور گیا کہاں؟ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ تمام دیوالیہ پن محض ایک ناٹک تھا۔ لوگ بتاتے تھے کہ اس معاملے میں ایک عورت بھی ملوّث ہے، لیکن ایک بوڑھا کسی عورت سے کیا چاہے گا؟ یہ سب کچھ تودرس ہی کی طرح ہونا تھا۔ اگر اُس نے خود کو زندہ دفن کیا ہوتا تو گیتزل بھی اپنی قبر آپ کھودتا۔ یہ سب داستان بُھتنوں کی کارستانی تھی۔ آخر بُھتنے نقّال نہیں تو اَور کیا ہوتے ہیں؟ اور پھر آئینہ کیا کرتا ہے؟ اسی لیے جب گھر میں میّت رکھی ہو تو آئینے کو ڈھانپ دیتے ہیں۔ لاش کا عکس دیکھنا بدشگونی ہے۔

گیتزل کی ملکیت میں جتنی بھی جائیداد تھی اس کا قبضہ لے لیا گیا۔ قرض خواہوں نے فوگل کے لیے روٹی کا ٹکڑا تک نہ چھوڑا۔ اسے محتاج گھر میں جا کر رہنا پڑا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں زاموس چھوڑ چکی تھی۔ مگر خدا میرے دشمنوں کو ایسا ہی بڑھاپا نصیب کرے جیسا کہتے ہیں کہ فوگل کا ہوا۔ وہ جس چٹائی پر لیٹی پھر وہاں سے اٹھ نہ سکی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پہلے خواہش کی تھی کہ اس کی قبر کے کتبے پر شوہر کے

طور پر گیتزل کا نہیں بلکہ تودرس کا نام لکھا جائے۔ لیکن کسی نے اس کی قبر پر کتبہ تو کیا پتھر بھی رکھنے کی زحمت نہ کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قبر پر جھاڑجھنکاڑ اگ آیا اور بالآخر اس کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

گیتزل کا کیا بنا؟ اور تودرس کا کیا ہوا؟ کوئی نہیں جانتا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں ملے ہوں گے، لیکن کس لیے؟ تودرس یقیناً مر چکا ہو گا۔ دشکے نے اپنے باپ کی جائیداد کا کچھ حصّہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ بچا ہی نہ تھا۔ آدمی کو وہی رہنا چاہیے جو وہ حقیقت میں ہو۔ دنیا کی مشکلات نقّالی کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ آج کل اسے فیشن کہتے ہیں۔ پیرس میں کوئی نوسرباز ایسا لباس ایجاد کر دیتا ہے جس کا پچھلا حصّہ سامنے کی طرف ہو، اور جسے دیکھو وہی پہننا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ بُورنے ہوتے ہیں، سب کے سب۔

میں تمھیں جڑواں بہنوں کا قصّہ بھی سنا سکتی ہوں، لیکن رات کے وقت اس کے بارے میں زبان کھولنے کی ہمّت نہیں پڑتی۔ ان کا کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ یک جان و دو قالب تھیں۔ دونوں بہنوں کی موت ایک ہی دن واقع ہوئی، ایک کی زاموس میں اور دوسری کی کودلے میں۔ کون جانے، شاید ایک بہن حقیقی تھی اور دوسری اس کا سایہ!

مجھے سائے سے خوف آتا ہے۔ سایہ دشمن ہوتا ہے اور موقع ملتے ہی اپنا انتقام لے لیتا ہے۔

آئزک باشیوس سنگر

انگریزی سے ترجمہ : راشد مفتی

ایک شادی

کروچملنا اسٹریٹ پر بہت سے بدنام گھر تھے۔ گھر تو وہ صرف کہے کی حد تک تھے، اصل میں ان کے تہہ خانوں میں، جن کی تنگ کھڑکیاں اکثر دروازے کی سطح سے نیچی ہوتی تھیں، طوائفیں رہا کرتی تھیں۔ ان کی سرپرستی کرنے والے مردوں کو تاریک غارنما راہداریوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ باہر چوک میں، جہاں چوروں کا اڈّا تھا، دلّال بھی جمع ہوا کرتے تھے۔ مجھے اس وقت بھی اِتنا تو پتا تھا کہ طوائفیں ہوتی ہیں اور یہ کہ انہیں دیکھنا منع ہے کیوں‌کہ محض ان پر نظر ڈالنے سے بھی آدمی آلودہ ہو جاتا ہے، لیکن وہ کرتی کیا ہیں، یہ بات ابھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

میں انہیں اکثر پھاٹکوں کے پاس یا چوک میں کھڑے دیکھتا تھا۔ ان کے گال غازے سے پُتے ہوتے اور آنکھوں میں کاجل کی لکیریں ہوتیں۔ پیروں میں سرخ یا نیلے جوتے ہوتے اور وہ چَھپے ہوئے پھولوں والی شالیں اوڑھے ہوئے ہوتیں۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی سگریٹ بھی پی رہی ہوتی۔ میں ان کے پاس سے گزرتا تو وہ آواز لگاتیں، "ارے او، ننّھے پارسا! ارے او، چور حَسید! مُورکھ!"

ایک بار ایک طوائف نے مجھے چاکلیٹ دیا۔ میں بھاگ کھڑا ہوا اور چاکلیٹ گٹر میں پھینک دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جس چیز کو چُھو لیں وہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ تاہم بعض اوقات وہ میرے ابّا سے مذہبی مسائل پوچھنے آتی تھیں۔ جب بھی ان میں سے کوئی ہمارے گھر میں داخل ہوتی تو امّاں پریشان ہو جاتیں اور ان کے ہونٹ سِل جاتے۔ لیکن میرے ابّا کوئی فرق نہیں جانتے تھے۔ وہ ساری عورتوں سے نظریں چُراتے تھے۔ ان کے "مسائل" ناگزیر

طور پر ماں یا باپ کی برسی منانے سے متعلّق ہوتے تھے۔ یہ واحد مذہبی رسم تھی جو وہ ادا کرتی تھیں لیکن یادگاری شمع جلانے کا موزوں دن کبھی نہ نکال پاتیں۔

ایک دن ایک نوجوان، جس کا حلیہ کسی کاریگر کا سا تھا، ہمارے ہاں آیا۔ اس کے سر پر روایتی ٹوپی تھی لیکن بدن پر نئے زمانے کی چھوٹی جیکٹ اور پاؤں میں بٹنوں والے جوتے تھے۔ اس نے کالر نہیں لگایا ہوا تھا بلکہ صرف قمیص کا سامنے والا حصّہ، جو کاغذی تھا اور دھات کی کالرپن سے جوڑا گیا تھا، پہن رکھا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، رخسار دھنسے ہوے اور ٹیڑھی ناک اس طرح زرد تھی گویا حال ہی میں بیماری سے اٹھا ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا تھا جن کی نرمی نے مجھے روزے کے دنوں اور جنازوں کی یاد دلا دی۔ ان آنکھوں کا تاثر ان ماتم گساروں کا سا تھا جو سوگ کی مدّت کے بارے میں سوال پوچھنے آیا کرتے تھے۔

اتّفاق سے امّاں مطالعے کے کمرے میں تھیں جہاں میں بھی گمارا کی ایک جلد لیے پڑھنے کا بہانہ کر رہا تھا۔

"کہو، کیا خوش خبری لائے ہو؟" میرے ابّا نے پوچھا۔

نوجوان بڑبڑایا اور باری باری سرخ اور زرد ہونے لگا۔

"ربی، کیا طوائف سے شادی جائز ہے؟"

میری امّاں دنگ رہ گئیں۔ ابّا نے نوجوان سے چند سوال پوچھے اور مجھ پر ایک سخت گیر نظر ڈالی۔

"باہر جاؤ!"

میں باورچی خانے میں چلا گیا اور نوجوان کچھ دیر مطالعے کے کمرے ہی میں رہا۔ تھوڑی دیر بعد امّاں بھی باورچی خانے میں آ گئیں اور بولیں، "اس دنیا میں ہر طرح کے خبطی لوگ ہیں۔"

ابّا کا فیصلہ تھا کہ ایسی شادی جائز ہے۔ درحقیقت، کسی یہودی لڑکی کو گناہ کی زندگی سے چھڑانا ایک نیک عمل ہے۔ نوجوان نے مزید کچھ سننے کا انتظار نہیں کیا۔ اس نے فوراً ابّا سے اس شادی کو سرانجام دینے کی بات طے کر لی۔ پھر وہ زور سے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

ابّا باورچی خانے میں آئے۔

"یہ کیا دیوانگی ہے؟" میری امّاں نے پوچھا۔

"اُسے -- جیساکہ لوگ کہا کرتے ہیں -- محبّت ہو گئی ہے۔"

"ایک طوائف سے؟"

"ہوں---" اور ابّا اپنی کتابوں کی طرف لوٹ گئے۔

اب مجھے یہ یاد نہیں کہ شادی ہونے سے پہلے کتنا وقت گزرا۔ لڑکی کو تیار ہونا تھا۔ اسے مذہبی رسم کے مطابق غسل کے لیے جانا تھا۔ نواح کی عورتیں اس کے لیے مصروف رہنے لگیں۔ ساری گلی کو اس قصّے کا علم تھا اور پنساری کے ہاں، قسائی کی دُکان پر، یہاں تک کہ عبادت گاہوں میں بھی اس پر بات ہوتی رہتی تھی۔

ہمارے ہاں ہونے والی شادیاں عام طور پر سادہ تقریبات ہوتی تھیں جن میں گنتی کے چند ہی لوگ شریک ہوتے تھے۔ زیادہ تر موقعوں پر میرے ابّا کو دس آدمیوں کی لازمی تعداد پوری کرنے کے لیے عبادت گاہ سے کچھ لوگ بلانے پڑتے تھے۔ لیکن اِس بار ہمارا گھر وِیانیز بال روم نظر آ رہا تھا۔ ہر دوسرے لمحے دروازہ کھلتا اور کوئی چور یا دلّال اندر داخل ہوتا۔ زیادہ تر مہمان طوائفیں تھیں جو شُترمرغ کے پَروں سے سجے ہیٹ پہنے، ریشم اور مخمل سے آراستہ تھیں۔ یہ امر کہ ایک باعزّت نوجوان ایک کسبی سے محبّت کرنے لگا ہے، جرائم پیشہ طبقے کی، بالخصوص اس طبقے سے تعلّق رکھنے والی عورتوں کی جیت تھی۔ یہ اس بات کا شگون تھا کہ ان دُھتکارے ہوؤں کے لیے بھی کوئی امید باقی ہے۔ نائیکاؤں نے مقدّس دنوں میں عبادت گاہ کے لیے مخصوص، خانہ دار عورتوں کی سی وِگیں اور شالیں اوڑھ رکھی تھیں۔ طوائفیں لمبی آستینوں اور اونچے گلے کے لباس پہنے ہوے تھیں۔ سب نے اندر آتے وقت میزوزہ (۱) کو بوسہ دیا اور میری امّاں کو روزبخیر اور خدامدد کہتے ہوے سلام کیا۔ امّاں کا چہرہ زرد تھا اور وہ پریشان کھڑی تھیں۔ پڑوس سے کچھ معزّز خواتین آ گئی تھیں۔ وہ محافظوں کی طرح امّاں کو گھیرے میں لیے ہوے تھیں کہ انھیں کوئی آلودگی چھو نہ جائے۔ مگر ابّا کے چہرے پر تاثر کی کوئی تبدیلی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا یہ ہنگامہ کسی بھی صورت ان سے تعلّق نہ رکھتا ہو۔ وہ اپنی رحل کے پاس کھڑے، ایک جِلد کے مطالعے میں مصروف، کاغذ کے ایک ورق پر یادداشتیں لکھتے رہے۔ باقی ہر شخص دولھادلھن کا منتظر تھا۔

میں نے بالکونی میں قدم رکھا تو پیادہ رووٗں اور صحن کے پھاٹک پر ایک ہجوم کو کھڑے دیکھا۔ کچھ نائیکائیں اور طوائفیں بھی بالکونی میں آ

گئی تھیں۔ اچانک ہلچل سی اٹھی۔ ایک احاطے سے دولھادلھن نمودار ہوے۔ دولھا نے نیا اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے پیروں میں اعلی چمڑے کے چمک دار جوتے تھے۔ دلھن نازک بدن اور گہری رنگت کی تھی۔ وہ کم گو اور عزّت دار لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

بالکونی میں کھڑی عورتوں نے عجلت میں اپنے اپنے رومال نکالے اور آنکھیں پونچھنے لگیں۔

"ذرا دیکھو تو، کیسی زرد ہو رہی ہے۔"

"کیا روزے رکھ رہی ہے؟"

"ہائے، کیسی پیاری لگ رہی ہے!"

"خدا میرے مقدّر کو اس کے چہرے کی سی چمک دے۔"

"خدا کرے تمھاری شادی پر ہم پھر ملیں۔"

"اچھا اچھا، اب زیادہ باتیں مت بناؤ۔۔۔"

"امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

ایک دلّال، جو دیونما، یک چشم آدمی تھا اور جس کے ماتھے کی پوری چوڑائی پر ایک خم دار داغ تھا، ہمارے مطالعے کے کمرے میں سامان کو سلیقے سے لگانے لگا۔ ایک نائیکہ جس نے وِگ لگا رکھی تھی، عورتوں کو جھڑک رہی تھی کہ وہ دیواروں کے قریب رہیں۔ مہاسوں سے بھرے چہرے والی ایک لڑکی بیک وقت قہقہے اور چیخیں مار رہی تھی۔ یہ محض شادی نہیں بلکہ کامنسکی تھیٹر میں پیش ہونے والی کوئی تمثیل تھی۔ عام طور پر ہم عبادت گاہ کے داروغہ کے بغیر کام چلا لیتے تھے لیکن دلّال اپنا داروغہ ساتھ لائے تھے جو اُنھیں کی برادری کا ایک بونا تھا۔

دلھن کمرے میں داخل ہوئی تو عورتوں نے اسے ہاتھوں‌ہاتھ لیا۔ وہ اسے چومنے اور گلے لگانے، اور اس کو لے کر ناچنے لگیں۔ وہ اسے چھوڑنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ اس پر دعاؤں کا سیلاب انڈیل دیا گیا اور وہ ہر ایک کو ایک ہی فقرے سے جواب دیتی رہی: "خدا تمھاری قسمت بھی ایسی ہی کرے!"

یہ دعا سن کر ہر عورت کے منھ سے ایک گھٹی ہوئی سُبکی سی نکلتی۔ میرے ابّا شادی کی دستاویز تیار کرنے بیٹھ گئے۔ تاہم ایک کڈھب مسئلہ سامنے آیا۔ ابّا نے سرگوشی میں داروغہ سے مشورہ کیا۔ پھر اپنی ایک ربّانی کتاب دیکھی۔ یہ لکھنا تو بےمعنی تھا کہ دلھن کنواری ہے؛ مگر نہ تو وہ بیوہ تھی اور نہ مطلقہ۔ اس کا کیا حل نکلا، اور آیا دلھن کا حصّہ دو سو زوزِم ہی

رکھا گیا، جو کنواریوں کے لیے مخصوص ہے، یا اس سے کم، یہ مجھے یاد نہیں۔ چار آدمیوں نے عروسی چھپرکھٹ کے پائے سنبھال لیے۔ دولھادولھن دونوں ہی یتیم تھے، لہذا چھپرکھٹ تک ان کی راہ نمائی "چچوں" اور "خالاؤں" نے کی۔ سب کچھ شرعی ہدایات کے مطابق انجام دیا گیا۔ دولھا کو سفید لنِن کی عبا پہنائی گئی۔ دلھن کا چہرہ ایک رومال سے ڈھانپا گیا۔ میرے ابّا نے خیروبرکت کی دعائیں پڑھیں اور دولھادلھن کو مقدّس شراب کی ایک ایک چُسکی دی۔ جب دلھن نے اپنی درمیانی انگلی آگے بڑھائی اور دولھا نے یہ الفاظ ادا کرتے ہوے کہ "دیکھ، مقدّس ہے تُو میرے لیے"، اسے انگوٹھی پہنائی تو تمام عورتوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ایک نوعمر کی حیثیت سے میں اُس وقت بھی حیران تھا کہ عورتیں اپنے آنسوؤں اور ہنسی کو ایک دوسرے کے ساتھ کتنی عجلت سے بدل سکتی ہیں۔ تقریب کے بعد بوسوں اور نیک خواہشوں کا عمومی تبادلہ ہونے لگا۔ میز طرح طرح کی شرابوں اور دوسرے مشروبوں سے بھری ہوئی تھی۔ بڑے بڑے اسفنجی کیک تھے۔ "خواتین" اپنے انگوٹھوں اور درمیانی انگلیوں میں انتہائی احتیاط سے کیک کی قاشیں لیے، اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کو نزاکت سے ہلاتی، ذرا ذرا سا کیک کھاتے ہوے، اپنا اپنا مشروب آہستہ آہستہ پی رہی تھیں۔ آج کا دن ان سے منسوب تھا۔ آج وہ اندھیرے تہہ خانوں میں بھٹکنے والی دُھتکاری ہوئی مخلوق نہیں بلکہ تقریب میں مدعو معزز رشتےدار تھیں۔ مرد، جو چائے کے گلاسوں میں وِسکی پی رہے تھے، جلد ہی اپنی گفتگو میں ہکلانے اور لڑکھڑانے لگے۔

ان میں سے ایک شخص دوڑ کر میرے ابّا کے پاس گیا اور بولا، "ربی، تم ایک حیرت انگیز یہودی ہو!"

"آدمی کے لیے صرف ایک اچھا یہودی ہونا ہی کافی ہے۔" میرے ابّا نے جواب دیا۔

"ربی، میں تمھارے لیے جان دے سکتا ہوں۔"

"خدا نہ کرے--- ایسی باتیں منھ سے نہیں نکالنی چاہییں۔"

"ربی، میں تمھارے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوں۔"

ابّا نے حسرت سے اپنی کتابوں کو دیکھا۔ کاش یہ لوگ رخصت ہو جائیں اور وہ اپنی کتابوں کی طرف لوٹ سکیں۔ لیکن ان لوگوں کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ جام پر جام چڑھاتے رہے۔ ایک "چچا" نے میرے ابّا سے

پینے پر اصرار کیا۔

ابّا نے انکار کر دیا۔ "مجھے پینے کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے معدے کا عارضہ ہے۔ خدا نہ کرے تم ایسی تکلیف سے دوچار ہو۔"

"لیکن ربی، یہ وِسکی تو بہت ہلکی ہے۔"

"مجھے اجازت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔"

"ہونہہ، ڈاکٹر کیا جانتے ہیں؟ لغو بات!"

بہت اصرار پر میرے ابّا نے تھوڑی سی چکھی۔ عورتوں نے امّاں کو اپنے دائرے کے رقص میں شریک کرنا چاہا لیکن وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔ انھیں گھٹیا لوگوں سے گھلنے ملنے کی خواہش نہیں تھی۔ مجھے وائن اور وِسکی پیش کی گئی اور اتنے کیک اور بسکٹ دیے گئے کہ میری سب جیبیں بھر گئیں۔

کچھ دیر بعد کمرہ خالی ہونے لگا۔ میں بالکونی میں گیا تو دیکھا کہ دولھادلھن اُسی احاطے میں لے جائے جا رہے ہیں جہاں سے وہ آئے تھے۔ میری امّاں کمرے میں تبھی آئیں جب آخری مہمان بھی رخصت ہو چکا۔ باہر سردی تھی مگر انھوں نے تمام کھڑکیاں کھول دیں تاکہ تازہ ہوا اندر آ سکے۔ کیک بسکٹ اور مشروبات میں سے جو کچھ بچ رہا تھا انھوں نے باہر پھینک دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ کئی دن بدحواس رہیں۔ میں نے انھیں باربار یہی کہتے سنا:

"خدا کرے میں اُس دن تک جیوں جب ہم اِس لعنتی گلی سے نکلیں---"

بعد میں مَیں بہت دنوں تک لوگوں کو نوبیاہتا جوڑے کی باتیں کرتے سنتا رہا۔ ان کے بارے میں حیت انگیز باتیں کی جاتیں۔ سابقہ طوائف کا رکھ رکھاؤ بالکل کسی خانہ دار عورت کا سا تھا۔ وہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ مذہبی رسم کے مطابق غسل کے لیے جاتی؛ قسائی کے ہاں سے حلال گوشت خریدتی؛ ہر سبت اور تعطیل کے دن کے اجتماع میں عبادت گاہ کے زنانہ حصّے میں موجود ہوتی۔ کچھ وقت کے بعد میں نے سنا کہ وہ امید سے ہے۔ پھر -- یہ کہ اس کے ہاں بچہ ہوا ہے۔ تمام عورتیں حلفیہ کہتی تھیں کہ وہ کسی غیر مرد کو دیکھتی تک نہیں۔ کبھی کبھار شوہر بھی نظر آتا۔ وہ شادی والے دن کی دَمک گنوا چکا تھا اور بغیر کالر کی قمیص کا سامنے والا کاغذی حصّہ دوبارہ پہننے لگا تھا۔

ایک بار ایک دُکان میں، جہاں مجھے امّاں کے لیے کچھ خریدنے بھیجا

گیا تھا، میں نے ایک نوجوان عورت کو پوچھتے سنا: "لیکن اس کی پچھلی زندگی کے بارے میں جانتے ہوے وہ اس کے ساتھ کیسے رہ سکتا ہے؟"

"توبہ کے لیے کبھی دیر نہیں ہوتی۔" ایک معمّر عورت نے، جو خاتونِ خانہ کا سرپوش پہنے ہوے تھی، جواب دیا۔

"مگر پھر بھی، گھِن تو آتی ہی ہو گی۔۔۔"

"شاید وہ اس سے محبّت کرتا ہے۔" ایک اور خانہ دار عورت نے شریکِ گفتگو ہوتے ہوے کہا۔

"محبّت کرنے کے لائق اس میں ہے ہی کیا؟ سرکنڈے جیسی تو دُبلی ہے۔"

"ہر ایک کا اپنا اپنا ذوق ہے۔"

"خدا مجھے اس گفتگو پر معاف کرے۔" دُکان دار بولی۔ "زبان، خاموش ہو جا!" اس نے دو انگلیوں سے اپنے لبوں کو ٹھوکا دیا۔

اس وقت کے بعد سے میں پھاٹکوں اور گلی کے لیمپوں کے پاس کھڑی ہونے والی لڑکیوں کو مزید دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ ان میں سے کچھ بھدّی، موٹی اور عام سی دکھائی دیتی تھیں۔ ان کی کاجل لگی آنکھوں میں ایک طرح کا گستاخانہ غرور جھلکتا تھا۔ بعض خاموش، اداس اور سمٹی ہوئی سی لگتی تھیں۔ ایک ایسی تھی جو لِتھوانیا کے لہجے میں بولتی تھی اور میری تفریح کا مستقل ذریعہ تھی۔ وہ ایستھر کی مٹھائیوں کی دُکان میں داخل ہوتی اور کہتی، "آج یہاں اتنی اچھی خوشبو کِتھ چیتھ کی آ رہی ہے؟ ذرا پنیر کے کیک کا ایک چھوٹا تھا ٹکڑا دینا۔۔۔ مجھے اِتھ کی شدید خواہش ہو رہی ہے۔۔۔"

بعض اوقات مَیں اپنے احاطے میں باتیں کرتی ہوئی نوکرانیوں کی گفتگو سنتا کہ معصوم نوجوان لڑکیوں کو اٹھانے کے لیے، جو یتیم یا دیہات کی لڑکیاں ہوتیں، رات کے وقت بندرگاہ میں دلّال کس طرح گھومتے ہیں۔ انھیں گناہ کی زندگی میں دھکیل دیا جاتا اور پھر جہاز میں سوار کرا کے بیونس آئرس لے جایا جاتا۔ وہاں وہ چندے ناپاک آدمیوں کے ساتھ رہتیں اور پھر ان کے خون میں ایک خطرناک کیڑا سرایت کر جاتا جس سے ان کا گوشت سڑنے لگتا۔

یہ کہانیاں بیک وقت حیران کن اور ہولناک تھیں۔ دنیا میں عجیب و غریب واقعات ہو رہے تھے۔ صرف اوپر آسمان ہی پر نہیں بلکہ یہاں زمین پر بھی بہت سارے راز تھے۔ مجھے یہ خواہش مارے ڈال رہی تھی کہ جلدی سے

بڑا ہو جاؤں اور ارض و سما کے سارے راز، جن سے نوعمر لڑکوں کو روکا جاتا ہے، مجھ پر کھل جائیں---

---

(۱) میزورہ : کپڑے کا ٹکڑا جس پر ایک طرف عہدنامۂ قدیم کی آیات اور دوسری طرف خدا کا ایک نام لکھا ہوتا ہے اور یہ غلاف گھر کے دروازے پر لٹکایا جاتا ہے۔

آج

خزاں ۱۹۸۹

تاراشنکر بنرجی ستیہ جیت رے اسد محمد خاں
محمد خالد اختر ڈونلڈ بارتھیم ولیم سیرویان
افضال احمد سید ذی شان ساحل نسرین انجم بھٹی سعیدالدین
نیّر مسعود فروغ فرخ زاد بابا مقدّم

سرما ۱۹۹۰

نجیب محفوظ لیو تالستائی کِیم مُونزو
مظفّر علی سیّد فہمیدہ ریاض عذرا عباس
احمد فواد محمد خالد اختر اکرام اللہ

بہار ۱۹۹۰

اتالو کلوینو امین مالوف محمد عمر میمن
محمد سلیم الرحمٰن جیک لنڈن محمد انور خالد
زیبا الیاس محمد خالد اختر تادیوش روزےوچ
زبگنیو ہربرٹ وِسلاوا شمبورسکا الیگزانڈر واٹ

گرما ۱۹۹۰

وِجے دان دیتھا انور خاں حسن منظر
محمد سلیم الرحمٰن شمس الرحمٰن شمس الحق
فہمیدہ ریاض

خزاں ۱۹۹۰

منوچہر خسروشاہی بابا مقدّم جمال میرصادقی
ثروت حسین ذی شان ساحل اوکتاویو پاز
یہودا امیحائی جولین بارنز فاروق خالد
محمد خالد اختر علی امام نقوی
خورخے لوئس بورخیس

سرما ۱۹۹۱

ابرہام یہوشوا . صلاح الدین محمود

فہمیدہ ریاض نیّر مسعود

یانِس رِتسوس انطونَ شمّاس

اسما راجا وِلاس سارنگ

بہار ۱۹۹۱

خصوصی شمارہ

گابریئل گارسیا مارکیز

گرما / خزاں ۱۹۹۱

منوج داس ضمیرالدین احمد نیّر مسعود

اکرام اللہ خالدہ حسین نکانور پارا

افتخار جالب اوسپ ماندلستام افضال احمد سید

عذرا عباس بیری پین ذی شان ساحل

گریگور فان ریزوری

سرما ۱۹۹۲

خصوصی شمارہ

مصر، جنوبی افریقا، موزمبیق، زمبابوے،

ہندوستان، امریکا، میکسیکو،

انگلستان، آئرلینڈ اور اٹلی

کی کہانیاں

بہار ۱۹۹۲

معاصر اردو فکشن : تیرہ کہانیاں اور ایک ناول

نیّر مسعود اسد محمد خاں

حسن منظر مسعود اشعر

انور خاں قمر احسن

فہمیدہ ریاض صغیر ملال

گرما / خزاں ۱۹۹۲

محمد خالد اختر　　اسد محمد خاں

نیّر مسعود　　فہمیدہ ریاض

افضال احمد سیّد　　میروسلاو ہولب

سیمون دُ بووار　　ژاں ژینے

آج کی کتابیں

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم تصنیف

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافت پابندِ سلاسل

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

گابریئل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

آج : بہار ۱۹۹۱

کتابی شکل میں

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

بازیافت

آئزک باشیوس سنگر

برنارڈ میلامڈ

اور

سال بیلو

کی کہانیوں کا انتخاب

ترجمہ اور ترتیب : راشد مفتی

جلد شائع ہو گا

ناشر : سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

ابتدا، دھواں اور پھول، پاتال،

جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی، اور

دریچہ بےصدا کوئی نہیں ہے

کے بعد

صابر ظفر

کا چھٹا مجموعہ

لہو ترنگ

شائع ہو گیا ہے

قیمت : ۹۹ روپے

منگوانے کا پتا : مکتبۂ دانیال، صدر، کراچی

فہمیدہ ریاض

کا سفرنامۂ بنگلادیش

زندہ بہار

جلد شائع ہو رہا ہے

ناشر : مکتبۂ دانیال، صدر، کراچی

ذی شان ساحل

کی نظموں کا دوسرا مجموعہ

چڑیوں کا شور

قیمت : چالیس روپے

آج کی کتابیں

افضال احمد سیّد

کی نظموں کا مجموعہ

دو زبانوں میں سزائے موت

قیمت : پچاس روپے

آج کی کتابیں

قیمت : چالیس روپے

آج کی کتابیں
بی ۱۴۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال صدر کراچی
ٹامس اینڈ ٹامس بک سیلرز صدر کراچی
کلاسیک شاہراہِ قائداعظم لاہور
بیکن بکس گلگشت ملتان